جلد ۶۳
عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اپریل ۱۹۶۵ء

آسان زبان میں اسلامی تعلیمات کا سلسلہ

از ابوسلیم محمد عبدالحیؔ

ایمان کی اہمیت

- ایمان کیا ہے؟
- دین میں ایمان کی کیا اہمیت ہے؟
- کن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے؟
- دین کا شعور اور ایمان ویقین بخشنے والی کتاب
- بچوں اور عورتوں کے لیے نہایت مفید کتاب

قیمت ۲ روپے

اِسلام کی تعلیم

- اسلام کیا ہے اور اس کے بنیادی عقائد کیا ہیں؟
- اسلامی عبادات کیسے انجام دی جائیں؟
- ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟

—— اس کتاب میں ——

اِن سوالوں کا اطمینان بخش جواب ملے گا

قیمت ۱/۷۵ روپے

دین کی حفاظت

- خواتین کی اصلاح وتربیت کیلئے بیش قیمت کتاب
- دین کی حفاظت وبقا کیلئے خواتین کی ذمہ داری
- فسادِ معاشرہ میں خواتین کو صحیح راہ پر قائم رکھنے کے لیے ضروری تدابیر

قیمت ۱/۷۵ روپیہ

دین کی خدمت

- دین کی خدمت کیوں کی جائے اور کیسے؟
- اس کام کی ضروری شرائط کیا ہیں؟
- غیر اسلامی نظام سے مومن کا تعلق۔
- اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات اور ان کا حل۔
- آسان اور شگفتہ اندازِ بیان قیمت ۲/۲۵ روپے

دین کی باتیں

- دین کیا ہے اور کیا چاہتا ہے؟
- اسلام کے بنیادی عقائد کیا ہیں؟
- اسلام کی بنیادی عبادات اور انکی ضروری تفصیلات
- آسان اور عام فہم زبان میں

قیمت ۲ روپے

تبلیغ کی حکمت

- تبلیغ کا صحیح طریقۂ کار کیا ہے؟
- داعی کی ضروری صفات کیا ہیں؟
- مخاطب کی نفسیات کا لحاظ کیسے کیا جائے؟
- دعوتِ دین پیش کرنے کا سلیقہ؟

قیمت ۱/۲۵ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹیڈ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ترجمان القرآن، لاہور

فہرست مضامین

عدد ۲	اپریل ۱۹۶۵ء	جلد ۶۳

سالانہ چندہ	دفتر رسالہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵۔اے ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جن حضرات نے گذشتہ تین چار ماہ میں جماعت اسلامی اور اُس کے امیر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر مختلف الزام فرماؤں کی طرف سے بھرپور نوازشات کی داستانیں سُنی ہیں وہ اِس حقیقت سے پوری طرح واقف ہیں کہ الزام دین جیسے سنگین الزام کے ثبوت میں جہاں عورت کی صدارت کا مسئلہ پیش کیا گیا وہاں دوسری دلیل یہ بھی پیش کی گئی کہ جماعتِ اسلامی جو اسلامی نظام کے قیام کا داعیہ لیکر اٹھی تھی اُس نے اپنا کعبۂ مقصود بدل کر اب جمہوریت کی سربلندی کے لیے اپنی جان کھپانی شروع کردی ہے یعنی العین سے یہ انحراف بلکہ ارتداد اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ جماعت دنیا پرست طالع آزماؤں کا ایک ٹولہ ہے جو دین کے نام پر اپنی سیادت قائم کرنا چاہتا ہے۔

جہاں تک عورت کی صدارت کے معاملہ کا تعلق ہے، اس کے بارے میں ہم ماہ جنوری کے اشارات میں جماعت کے موقف کی وضاحت کرچکے ہیں آج ہمیں اس دوسرے معاملہ کے متعلق کچھ کہنا ہے۔

یہ حضرات جماعت کے ارتداد کو ثابت کرنے کے لیے اُس کے وسیع لٹریچر میں سے چُن چُن کر وہ باتیں سامنے لاتے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح ہوسکے کہ آغاز میں جماعت مغربی طرز کی جمہوریت کی شدید دشمن تھی اور اسے اسلام اور مسلمانوں کے لیے فتنۂ عظیم سمجھتی تھی۔ اس کے بعد وہ اسلامی جمہوریت کی علمبردار بن کر سامنے آئی اور اب لفظ "اسلامی" کو بھی چھوڑ کر خالص مغربی جمہوریت کے شیدائی کی حیثیت سے جدوجہد کررہی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک اسلام

اور مسلمانوں کے لیے یہ ایک زبردست المیہ ہے کہ یہ جماعت جس باطل نظامِ سیاست کو ختم کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی، اب اسی کی سربلندی کے لیے نہ صرف کوشاں ہے بلکہ اسی کو اپنی جدوجہد کا مطلوب و مقصود قرار دیتی ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ایک بزرگ نے جماعت اسلامی کے اس انحراف پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے:

> "اتنے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اس ذلت کے ساتھ پسپائی، بلکہ ہتھیار رکھ دینے کا اعلان، محاذِ اسلامی پر کبھی کسی امیرِ لشکر نے کیوں کیا ہوگا۔ شکست تنہا ان امیر صاحب کی نہیں، شرمندگی ہم سب ہی کے حصّے میں آتی ہے۔"

انہی محترم بزرگ کا ایک مضمون اسی موضوع پر اس سے پہلے بھی شائع ہو چکا ہے جس میں انہوں نے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی طرف یہ فقرہ منسوب کرکے کہ "اصل مسئلہ اس وقت جمہوریت کی بحالی کا ہے۔" اسے پاکستان اور بیرونِ پاکستان کے لیے ایک زبردست دینی سانحہ سے تعبیر کیا تھا۔

ہم ترجمان القرآن کی حالیہ اشاعتوں میں اس امر کی پوری طرح وضاحت کر چکے ہیں کہ جماعت اسلامی اور اُس کے امیر نے اللہ تعالیٰ کے فضل سے اُس مقدس مقصد سے ذرہ برابر بھی انحراف نہیں کیا، جسے وہ لے کر اٹھے تھے۔ حکومتِ الٰہیہ کا قیام اور نظامِ اسلامی کا نفاذ ہی جماعت کا اصل مقصود ہے۔ اسی نصب العین کے حصول کے لیے یہ زندہ ہے اور اسی کی جدوجہد میں وہ اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں کھپانے کا عزم رکھتی ہے۔ البتہ ہم اپنے کرم فرماؤں سے بصد احترام یہ بات کہتے ہیں کہ وہ براہِ کرم اس ٹھوس حقیقت پر ضرور غور کریں کہ عالمِ واقعات میں کسی اُونچے اور بلند نصب العین کا حصول اُتنا سہل اور آسان نہیں ہوتا جتنی کاغذ پر قلم کی مشق آسان ہوتی ہے۔ صدیوں کے بگڑے ہوتے ماحول میں، جہاں اسلام کی اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی اقدار بالکل تباہ ہو کر رہ گئی ہیں، جہاں ایک غلط نظامِ حیات سیاسی اور معاشی قوت کے بل بوتے

پر اپنی پوری جڑیں معاشرے کے رگ وپے میں اُتار چکا ہے، اور جہاں مغربی فکر و تہذیب اور نظریات و عملیات کا غلبہ آکاس بیل کی طرح ہماری زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہو کر انہیں برباد کر رہا ہے، وہاں اگر کوئی جماعت اسلام کے غلبے کا راستہ صاف کرنے کے لیے ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے جس میں کم از کم آزادی کے ساتھ اس غلط نظامِ حیات کی یلغار کا مقابلہ کیا جا سکے تو اُسے پسپائی سے تعبیر کرنا بہت بڑی زیادتی ہے۔

زمان و مکان اور ظروف و احوال کو ملحوظ رکھتے ہوئے بتدریج کام کرنا اور اندھا دھند ایسی پیش قدمی نہ کرنا جس کے لیے زمین تیار نہ ہو، عین تقاضائے حکمت ہے۔ اِس حکمت کو کسی ہوشمند نے کبھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ انسان تو خیر کمزور اور ضعیف ہے۔ وہ ان رعایتوں کا لحاظ کرنے پر مجبور ہی ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے بھی جو قادرِ مطلق ہے۔ احکام و ہدایات دینے میں انسان کے حالات کی رعایتوں کو ہمیشہ اپنی نگاہ میں رکھا ہے۔ اُس نے مختلف ادوار میں اپنے رسولوں کے ذریعہ سے انسان کی ہدایت کے لیے جو مقدس نظام نازل فرمایا اس میں زمان و مکان کے تقاضوں کی پوری پوری رعایت کی گئی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام پر ہی وہ آخری شریعت نازل کر دی جاتی جو خاتم الانبیاء حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی ہے۔ آغاز اور تکمیل کے درمیان جو مختلف مراحل درپیش تھے اُن کے پیشِ نظر ہی اللہ تعالیٰ نے دین کو اپنی مصلحت کے تحت ایک خاص مدت کے بعد مکمل فرمایا۔

اللہ تعالیٰ کے بعد اگر زمان و مکان کے مصالح سے بے نیاز اگر کچھ مقدس ہستیاں ہو سکتی تھیں تو وہ انبیاء علیہم السلام کی ہستیاں تھیں جن کی خداوند تعالیٰ براہِ راست نگرانی فرماتا تھا اور اپنی حکمت کے تحت اُن کے ذریعہ اُس مقصد کی تکمیل کرواتا تھا جو انسانیت کا حقیقی اور صحیح مقصد ہے۔ جب ہم ان مقدس نفوس کی اصلاحی سرگرمیوں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ان جلیل القدر پیغمبروں نے بھی اپنی جد و جہد میں حالات کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے۔

بدر و حُنین کے معرکے پہلے روز ہی برپا نہیں کر دیئے گئے، بلکہ ان سے پہلے ان کے لیے تیاری کا سامان فراہم کیا گیا۔ اسی طرح چور کا ہاتھ کاٹنے، شرابی کو دُرّے مارنے اور زانی کو سنگسار کرنے کی سزائیں دینے سے پیشتر ایک ایسا پاکیزہ ماحول تیار کرنے کی کوشش کی گئی جس میں قوت نیکی اور خدا ترسی کے ہاتھ میں ہو، لوگوں کے ضمیر بیدار ہوں اور وہ اخلاق کی پاکیزگی کو دنیا کی ہر متاع سے زیادہ عزیز خیال کرتے ہوں۔

یہ گذارشات ہمارے اپنے ذہن کی اختراع نہیں بلکہ یہ وہ حقائق ہیں جن کی تصدیق قرآن، اسوۂ رسول، خلافتِ راشدہ کے طرزِ عمل، صحابہ اور امّت کے دوسرے پاکباز لوگوں کی زندگیوں، فقہ اسلامی کی تصریحات اور عقل سے ہوتی ہے۔

دُور نہ جایئے، زمان و مکان کی رعایت اور اختلافِ احوال کے لحاظ سے طریق کار میں تغیر کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے ذرا اس بات پر غور کیجیے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے حفظ و بقا کے لیے آج سیکولرزم کو کتنا ضروری خیال کیا جا رہا ہے اور وہاں کے مسلم زعما اس پر کتنا زور دے رہے ہیں۔ اسلامی نظام کا قیام تنہا جماعت اسلامی کا ہی نصب العین نہیں ہے۔ یہ فرض ہر اُس شخص پر عائد ہوتا ہے جو اللہ اور اُس کے رسول پر صدق دل سے ایمان رکھتا ہو۔ اس سے کوئی مسلمان بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ جب حقیقت یہ ہے تو ماننا پڑیگا کہ جو کچھ ہمارے لیے باطل ہے وہ ہر مسلمان کے لیے باطل ہے۔ اب اگر یہ اصرار کیا جاتا ہے کہ آخری منزلِ مقصود سے کم تر کسی چیز کو کسی مرحلے میں عارضی طور پر بھی گوارا کر لینا سخت گمراہی ہے تو پھر ہندوستان میں سیکولرزم کی حمایت یا کم از کم اسے ایک وقتی مجبوری کے تحت برداشت کرنا بھی اتنی ہی بڑی زیادتی ہے جس کی وجہ سے یہ حضرات پاکستان کی جماعت اسلامی کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار کر رہے ہیں۔ اگر جماعت اپنے ملک کے حالات کی نزاکت کے پیشِ نظر جمہوریت کی حمایت کر کے اِہدام دین کا ارتکاب کر رہی ہے تو پھر اس الزام سے وہ مقدس لوگ کس طرح

بچ سکتے ہیں جو ہندوستان میں ایک ایسے نظام کی حمایت کر رہے ہیں جو لادینی کے نظریے پر مبنی ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا جائے اور اس میں گروہی وابستگیوں کو قطعاً حائل نہ ہونے دیا جائے۔ اگر زمان و مکان اور حالات کی نزاکتیں سرے سے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں تو پھر پاکستان، ہندوستان، برطانیہ، مصر اور عرب الغرض سب ممالک میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں انہیں اسلامی نظام کے قیام کی طرف فی الفور براہِ راست پیش قدمی کر"دانی چاہیے اور اس سے کم تر کسی چیز کو سرے سے برداشت ہی نہ کرنا چاہیے۔

یہ بات اگرچہ عقل و حکمت اور تدبر اور دانائی کے بالکل خلاف ہے لیکن اگر وقتی مصلحتوں اور حالات کے تقاضوں سے بے پروا اسلامی نظام کے قیام کی کوشش کرنا لازم ہو تو پھر درمیان کی کڑیوں کو یکسر نظر انداز کر دینا اشد ضروری ہے۔ پھر تدریج اور تقدیم و تاخیر کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ خود یہ حضرات ہر مرحلے پر وقت کے حالات اور مصالح کو سامنے رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں سیکولرزم کی حمایت آخر حالات کی اسی رعایت ہی پر تو مبنی ہے جس کے جرم میں جماعت اسلامی پاکستان اور مولانا مودودی کو گردن زدنی قرار دیا جا رہا ہے۔ ابھی تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے کہ ہندوستان کے وہی بزرگ جو جماعت اسلامی پاکستان پر جمہوریت کی حمایت کی وجہ سے سخت برہم ہیں اور اسے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی موت سے تعبیر کرتے رہے ہیں، خود انہوں نے اپنے ایک نوٹ میں حالات کی رعایت کو ضروری اور دینی جدوجہد کی راہ کا سنگِ میل قرار دیا ہے۔ اس نوٹ کا پس منظر یہ ہے کہ کسی صاحب نے جماعت اسلامی ہند پر یہ گرفت فرمائی تھی کہ:

"یہ (جماعت اسلامی ہند والے) وہی تو ہیں جو ابھی کل تک کہہ رہے تھے کہ سیکولر حکومت ایک طاغوتی و شیطانی طریق حکومت ہے اور اب کہتے ہیں کہ ہم

ہندوستان کی سیکولر حکومت کے وفادار ہیں۔ ان کے دعوئ وفاداری پر کیسے یقین کیا جائے؟"
اس پر مولانا ارشاد فرماتے ہیں:

"قرار دادِ جرم کی بنیاد یہ ہے کہ دونوں دعووں میں تضاد و تناقض ہے اور حکومتِ الٰہیہ پر ایمان رکھنے والا کسی سیکولر سرکار کا وفادار کیونکر ہو سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بنیاد ہی سرے سے صحیح نہیں۔ دونوں دعووں میں تناقض کوئی نہیں، صرف تغایر ہے۔ ایک شے تو ہوتی ہے کوئی عقیدہ بطور آئیڈیل یا آخری مطمحِ نظر کے اور ایک شے ہوتی ہے اس کی عملیت یہ قیدِ زمان و مکان یا ز(بو انکلامی زبان میں) بہ رعایتِ ظروف و احوال۔ آئیڈیل تو اسلام کا اوّل دن سے حکومتِ الٰہیہ ہے لیکن آخر ۱۳ سال تک خود سرورِ کائنات نے مکہ کی غیر اسلامی حکومت کے اندر بسر کیے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعونی حکومت کے ماتحت ایک مدت بسر کی۔ ابراہیم علیہ السلام نے ایک حصّہ عمر کا جاہلی حکومت کے اندر گزارا۔ مسیح علیہ السلام نے ساری عمر رومی مشرک حکومت کے تحت بسر کی۔ اور غداری اور بے وفائی ان پیغمبرانِ برحق کی ایک بار بھی منقول نہیں۔ بلکہ یوسف علیہ السلام نے تو اس غیر الٰہی حکومت کے ماتحت عہدہ تک اپنی طلب سے حاصل کر لیا۔ تو جب حالات آئیڈیل کے لیے سرے سے ناسازگار ہوں اور کوئی توقع درجۂ ضعیف میں بھی قیامِ حکومتِ الٰہیہ کی نہیں ہو سکتی تو جو صورتِ حال سب سے غنیمت اور اہون اور قابلِ عمل نظر آئے اس کو قبول کیا جائیگا۔ اور قانون وقت کے مطابق چل کر کوئی شبہ بھی غداری کا نہ پیدا ہونے دیا جائے گا۔ اسلام ایسی آئیڈیل ازم کا قائل نہیں جسے کوئی تعلق حقائق سے نہ ہو بلکہ جو ہوا میں معلق ہو۔ اس میں جماعت اسلامی ہند والوں یا کسی بھی مسلمان گروہ کو کوئی بات نہ شرمانے کی ہے نہ گھبرانے کی۔"

مندرجہ بالا اقتباس میں خط کشیدہ سطور کا بغور مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ ان میں مقصد اور

حصولِ مقصد کے درمیان عملی دشواریوں کے جو کٹھن مراحل درپیش ہوتے ہیں۔ انہیں کس صفائی کے ساتھ تسلیم کیا گیا ہے اور پھر یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرائی گئی ہے کہ جو شخص یا گروہ بھی کسی بلند مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے وہ راستے کی مشکلات اور ناسازگاریوں اور موانع سے یکسر بے نیاز ہو کر نہیں چل سکتا۔ دنیا میں آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی نظام کے قیام کے لیے کسی گروہ کو صاف ہموار اور بالکل کھلا راستہ مل گیا ہو۔ ہر رائج الوقت نظام، زندگی کے سارے شعبوں پر پوری ہمہ گیری کے ساتھ مسلط ہوتا ہے، اور وہ تغیر کے سارے راستوں کو مسدود کرکے اپنی فرمانروائی قائم کرتا ہے۔ حیاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہوتا جس پر اُس کی پوری گرفت موجود نہ ہو۔ اب اس کی جگہ جب کوئی فرد یا گروہ کوئی دوسرا نظام قائم کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اسے لامحالہ قدم قدم پر مختلف موانع اور دشواریوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ جگہ جگہ اُس کے دامن سے مخالفوں کے کانٹے اُلجھتے ہیں اور ہر گام پر اُس کا راستہ روکنے کے لیے زبردست چٹانیں حائل ہوتی ہیں۔ ان مختلف دشواریوں میں سے اپنا راستہ نکالنے کے لیے اُسے لامحالہ ہر مرحلے پر وہ تدبیر اختیار کرنی پڑے گی جس سے چند قدم منزلِ مقصود کی طرف بڑھنا ممکن ہو اور جس کے لیے موانع میسر آجائیں۔ یہی چیز قابلِ عمل، حکیمانہ اور عقل کے قریب ہے۔ اور اسی کی تلقین مولانا خود فرما رہے ہیں۔ ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اگر ان کی اپنی بیان کردہ اسی معقول روش کو جماعت اسلامی پاکستان اختیار کرے تو آخر اُس کی شامت کیوں آجاتی ہے۔

ہم جماعت اسلامی کی تاسیس کے وقت سے آج تک مسلسل یہ کہتے چلے آرہے ہیں کہ ہماری جدوجہد کا مقصد بجز رضائے الٰہی کے حصول کے اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن خود یہی مقدس مقصد اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اپنی انفرادی زندگی میں احکامِ الٰہی کی پابندی کرنے کے ساتھ اجتماعی زندگی میں بھی اُسی کے عطا کردہ قوانین جاری کرنے کی کوشش کریں تاکہ اہلِ ایمان کے لیے دین کے سارے مقتضیات کو باحسن طریق پورا کرنا ممکن ہو، اور وہ بھلائیاں فروغ پاسکیں جنہیں خدا کا دین

فروغ دینا چاہتا ہے اور وہ بُرائیاں دبیں جنہیں خدا کا دین دبانا اور مٹانا چاہتا ہے یہی وہ اصل غرض ہے جس کے لیے ہم سیاست میں دخل دیتے ہیں۔ ہمارے اس سیاسی کام کو خواہ کوئی شخص "دنیا داری" کہے یا "ہوسِ اقتدار"، لیکن وہ علیم و خبیر ذات جو دلوں کے بھید جانتی ہے، اُسے اس بات کا پوری طرح علم ہے کہ ہم یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کے اصل محرکات کیا ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خود حکومتِ الٰہیہ کا قیام بھی ہمارا مقصود و مطلوب نہیں بلکہ ہمارے اصل مقصد یعنی رضائے الٰہی کے حصول کا محض ذریعہ ہے۔ اور اس ذریعہ کو اپنے امکان کی حد تک عمل میں لانے کی کوشش کرنا بھی ہم اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارے پیش نظر اگر محض حکومتِ الٰہیہ کا نقشہ پیش کر دینا ہوتا تو ہمیں قطعاً زحمت نہ ہوتی۔ ہم خدا کے فضل سے اس نظام کو اس کی مثالی صورت میں پوری تفصیلات کے ساتھ کتابوں کے صفحات میں منتقل کر سکتے تھے۔ لیکن چونکہ ہم اس نظام کو کوئی ما فوق الطبعی عقیدہ خیال کر کے اسے محض روحانی سرور کا ذریعہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے ایک قابلِ عمل چیز سمجھ کر اس دنیا میں اسے نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں تاکہ باطل سے ستائی ہوئی انسانیت اس کے زیر سایہ سکون اور آرام حاصل کر سکے اس لیے عملی جد و جہد کی راہ میں ہمیں لامحالہ اُن حالات سے بھی سابقہ پیش آتا ہے جن میں دو ناگزیر بُرائیوں کے درمیان کم تر بُرائی کو عارضی اور وقتی طور پر گوارا کرنا پڑتا ہے۔ ہم یہ طرزِ عمل اُسی اصول کے تحت اختیار کرتے ہیں جس کی صحت خود یہ محترم بزرگ اور اُمت کے دوسرے اکابر تسلیم کر چکے ہیں اور جس کی رُو سے نامور علماء آج بھارت میں کھلے کھلے ہندو راج کی بہ نسبت سیکولرزم کو غنیمت سمجھ رہے ہیں۔

خواب و خیال میں بسنے والے ناقدین جو چاہیں کہتے رہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اسلام کے لیے حالات جتنے آج ناساز گار ہیں اتنے کبھی نہیں ہوتے۔ ان میں کچھ دخل تو اجتماعی زندگی کی تبدیلیوں کا ہے، کچھ غیر مسلم قوموں کے اقتدار کا اور کچھ اُن مسلمان قائدین کے غلط طرزِ عمل کا جن کے ہاتھ میں اس وقت مسلمان ممالک کی سربراہی اور قیادت ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ نقد و احتساب کرنے والے حضرات ذرا اُن مشکلات

اور موانع کو بھی ذہن میں رکھیں جو اس وقت اسلامی نظام کی راہ میں حائل ہیں۔ اس راہ کی سب سے بڑی دشواری وہ جکڑ بندی ہے جو ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی ہے۔ اور جس نے افراد کو مجبورِ محض بنا کر رکھ دیا ہے۔ اسے سوءِ اتفاق سمجھیے یا باطل نظام کے علمبرداروں کی فراست کہ انہوں نے اس نظام کو اتنا ہمہ گیر بنا دیا ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اور اُس کے قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں رہا جو اُس کے ہمہ گیر اثرات سے آزاد ہو۔ اگر آپ کوئی خالص ادبی کتاب لے کر اُس کا مطالعہ کریں تو اُس میں اُسی کی رُوح پُوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوگی۔ اگر فلسفہ اور نفسیات کی طرف رجُوع کریں تو آپ انہیں اسی کے شارح اور ترجمان پائیں گے۔ اگر حکومت اور قانون کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ صرف اسی کے نفاذ اور تسلط کے لیے وہ وجود میں آئے ہیں۔ اگر نظامِ معیشت اور معاشرت کا جائزہ لیا جائے تو آپ کو بڑی شدت کے ساتھ اس حقیقت کا احساس ہوگا کہ یہ بھی اسی کی ترقی اور نشوونما کے لیے تیار کیے گئے ہیں۔ الغرض آپ زندگی کا کوئی دُور دراز گوشہ بھی ایسا تلاش نہ کر سکیں گے جو اس باطل نظامِ حیات کی گرفت سے کسی قدر بھی آزاد ہو۔ اور تو اور زندگی کے خالص روحانی اور اخلاقی گوشوں پر بھی اسی کی پرچھائیں صاف دکھائی دیتی ہے۔ آج اگر کوئی فرد یا گروہ انسانیت کو اس نظام کے چنگل سے آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے زندگی کے کسی گوشے میں بھی کوئی ایسا محفوظ مقام میسر نہیں آتا جہاں سے وہ بڑے اطمینان کے ساتھ اپنی جد وجہد کا آغاز کرے۔

اسی طرح اُسے جس دوسری دُشواری سے سابقہ پیش آتا ہے وہ یہ ہے کہ اگر وہ جوں توں کر کے کسی کونے میں اپنے پاؤں جمانے کی کوشش بھی کرے تو اجتماعی حالات کا ریلا انہیں فوراً اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔

زمان و مکان کے سمٹ جانے کی وجہ سے ایک تو دنیا کے دُور دراز گوشے ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو چکے ہیں کہ اجتماعی تغیّرات کی ہر کروٹ سے وہ پُوری شدت کے ساتھ متاثر

ہوتے رہتے ہیں۔ پھر ان تغیرات کی رفتار اتنی تیز اور ان کی روانی تند ہوتی ہے کہ انسان اپنی خواہش اور تمنا کے علی الرغم اُن کے رُخ بہنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ آپ اگر ان تغیرات کے وسیع اور ہمہ گیر اثرات کا ہلکا سا جائزہ لینا چاہیں تو آپ صرف ریڈیو اور ٹیلیویژن کی کارگزاریوں پر غور کریں اور دیکھیں کہ انہوں نے ہماری معاشرتی زندگی کے دُور دراز گوشوں پر کس نوعیت کے نتائج کتنی برق رفتاری کے ساتھ مرتب کیے ہیں۔ ان کی وجہ سے ہماری نوخیز نسلیں کسی کلب اور سینما گھر میں نہیں بلکہ عین گھر کی چار دیواری میں والدین کی آنکھوں کے بالکل سامنے ایک ایسی تربیت حاصل کر رہی ہیں جس نے ہمارے معاشرتی ڈھانچہ کو بالکل متزلزل کر کے رکھ دیا ہے۔

یہ باطل نظام چونکہ مادیت کی بنیاد پر قائم ہے اس لیے اس میں معیشت اساس کے طور پر کام کر رہی ہے۔ اسی کے مطابق زندگی کی ساری قدریں متعین ہو رہی ہیں اور اسی کے استحکام کے لیے حیاتِ انسانی کی بیشتر سرگرمیاں وقف ہیں۔ یہ معیشت ہر قسم کی اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوتی چلی جا رہی ہے اور ہر قدم پر منصوبہ بندیوں کی گرفت میں آ رہی ہے۔ اسی صورتِ حال نے اشتمالیت اور اشتراکیت کو جنم دیا ہے۔ وہ ممالک جو آزاد معیشت کے علمبردار کہلاتے ہیں اُن کے ہاں بھی منصوبہ بندیوں کا ایک ایسا جابرانہ سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے جس نے فرد کی آزادی کو محض ایک خواب بنا کر رکھ دیا ہے۔ معاشی منصوبہ بندیوں کی کامیابی کا سارا دارومدار معاشرتی اور سیاسی جکڑبندیوں پر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے دَورِ جدید میں آزادی اور حرّیت کے بلند بانگ دعووں کے باوجود انسان انتہائی بے بسی کے عالم میں زندگی گزار رہا ہے۔ منصوبہ بندی کا زبردست دباؤ انہیں جس طرف چاہتا ہے بے زبان گلّے کی طرح ہانک کر لے جاتا ہے۔ اس حقیقت کو آپ صرف ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمارے اس ملک میں اس اخلاقی انحطاط کے دَور میں بھی پردے کو خاصی اہمیت حاصل ہے اور چند اونچے خاندانوں کو چھوڑ کر پاکستان کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت عورتوں کی بے حجابی کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ لیکن یہاں تعمیرات کے

جو نئے نقشے تیار کیے جا رہے ہیں اُن کی وجہ سے بغیر کسی قانونی دباؤ کے چند سالوں میں پردہ محض ماضی کی یادگار بن کر رہ جائے گا اور لوگ اپنی خواہش کے علی الرغم اپنی بہو بیٹیوں کو بے نقاب دیکھنے پر مجبور ہونگے۔ اگر منصوبہ بندی کے تحت تعمیرات کا ایک خاص طرز اتنے بڑے معاشرتی انقلاب کا ذریعہ بن سکتا ہے تو پھر معاشی منصوبہ بندیوں سے کیا کچھ تغیرات پیدا نہیں ہو سکتے۔ آپ اگر یورپ کی معاشرتی زندگی کے عظیم انقلاب کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس میں بہت سی تبدیلیاں صرف معاشی رجحانات کی رہینِ منّت ہیں اور ان میں ملکی قوانین کا کوئی خاص عمل دخل نہیں۔ یہ اختلاطِ مرد و زن، یہ شراب نوشی اور فحاشی، مال و دولت کی ایک نہ مٹنے والی ہوس، معاشرے کی طبقاتی تقسیم، ہر شخص کا سرعت کے ساتھ امیر بن جانے کا مجنونانہ جذبہ، خاندانی نظام کی بربادی، نوخیز نسلوں کی اخلاقی بے راہ روی، احترامِ انسانیت کا فقدان، انسان کے لطیف احساسات سے ایک عام بے پروائی بلکہ بیزاری اور بغاوت، اور انسانوں کے باہمی تعلقات میں کاروباری ذہنیت کی فرمانروائی، یہ سب انسانی زندگی میں معیشت کی غیر معمولی اہمیت کے بالکل فطری نتائج ہیں۔

اسی سلسلہ کی تیسری کڑی حکومت اور ریاست ہے۔ "النّاسُ علیٰ دینِ مُلوکِہم" ایک پرانا مقولہ ہے جس سے حکومت کی اہمیت پُوری طرح واضح ہوتی ہے۔ عوام الناس شعوری اور غیر شعوری طور پر اُنہی عادات کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں جنہیں محلات میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ جب تختِ شاہی پر کوئی خدا ترس انسان جلوہ گر ہُوا تو لوگوں کے اخلاق میں خود بخود ایک صحت مند تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوتی۔ اسی طرح جب تاج کا وارث کوئی علم دوست شخص بنا تو پھر عوام میں علم کے چرچے ہونے لگے اور جب بدقسمتی سے کوئی ظالم اور اخلاق باختہ فرد حکومت کے تخت پر متمکن ہُوا تو اخلاقِ عام کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ ظالموں نے بڑی آزادی کے ساتھ شریف لوگوں کو ستانا شروع کیا، رشوت کا عام چلن ہونے لگا اور عیاشی ایک فیشن کے طور پر

معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی اور دیکھتے دیکھتے پوری اجتماعی زندگی اخلاقی انحطاط کا شکار ہو کر رہ گئی۔

تاریخ کے اوراق کا اگر ذرا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ سارے انقلابات بادشاہ کی کسی تحریک اور اُس کے عزم اور ارادے کے ثمرات نہ تھے بلکہ محض اس کے برسرِ اقتدار ہونے ہی میں یہ تبدیلیاں خود بخود واقع ہوتی چلی گئیں۔ ان کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ اقتدار پہلے دن ہی سے عوام کی نظروں کا مرکز و محور رہا ہے۔ معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر اس نے ہمیشہ عوام کی نگاہوں کو مفتوح کیا ہے اور وہ بیچارے اپنے آپ کو غیر محسوس طور پر انہی سانچوں میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں جنہیں اقتدار پسند کرتا ہے۔

عوامی زندگی پر تخت کی گہری چھاپ کے یہ واضح نقوش اُن ادوار میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں جب ریاست کا دائرۂ عمل بڑا محدود تھا۔ جب بادشاہوں کو عوامی مسائل سے براہِ راست کوئی دلچسپی نہ تھی اور وہ عالمِ بالا میں زندگی کے مستعار لمحات گزار کر تخت و تاج اپنی اولاد کو منتقل کر جاتے تھے۔ وہ اگر اپنے فرائض کی انجام دہی میں بڑے مستعد بھی ہوتے تو ان کا کام صرف اسی قدر تھا کہ اپنی سلطنت کو غیر ملکی حملوں سے بچائیں اور ملک کے اندر امن و امان قائم رکھیں۔ اُن کے مقابلے میں رعایا کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ مالیہ، لگان اور اسی طرح حکومت کی طرف سے عائد کردہ دیگر محصولات پابندی کے ساتھ ادا کرتی رہے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ سرحدوں کی حفاظت اور نظم و نسق کے دائرے سے نہ حکومت تجاوز کرتی تھی اور نہ عوام اُس کے معاملات میں دخیل ہوتے۔ عوامی زندگی کی جوئے رواں جس رفتار سے چاہتی بہتی چلی جاتی۔

حکومت کے اس محدود دائرہ کار کی وجہ سے صنعتی انقلاب سے پہلے ملوکیت اور شہنشاہیت کے اندر بھی معاشرت اور معیشت بڑی حد تک آزاد تھیں اور معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کا کام کرنے والوں کے لیے بڑا وسیع اور کھلا میدان موجود تھا جس میں وہ جس طرح چاہتے اپنی صوابدید

کے مطابق کام کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مصلحین نے حکومت سے تعرّض کیے بغیر بعض بڑے انقلابی کام سرانجام دیئے اور معاشرے کے اندر بڑی خوشگوار تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ یہ مصلحین جس طرح کا نظام چاہتے رائج کر دیتے۔ حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوتا۔ وہ اصلاحِ حال کا جو پروگرام بناتے اُسی پر اپنی مرضی کے مطابق عمل کرتے اور بادشاہ اُس میں کسی طرح کا دخل نہ دیتے۔ حکومت کا دائرہ محدود ہونے کی وجہ سے دوسرے لوگوں کے لیے کام کرنے کی بڑی گنجائش موجود تھی۔ معاشرے کے حسّاس اور فرض شناس افراد اصلاحِ احوال کے لیے پوری کوشش کر سکتے تھے اور اُن کی یہ کوششیں پوری طرح بارآور بھی ہوئیں۔

دَورِ جدید کی ایجادات نے اور خصوصاً زمان و مکان پر انسان کی حیرت انگیز فتح نے ریاست کی ہیئت اور اُس کے دائرۂ کار کو بالکل بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس کا ایک اثر تو یہ ہے کہ ماضی کی حکومتوں کے برعکس، جو شہنشاہیت کی صورت میں بھی افراد کو فکر و عمل کی کافی آزادی دیتی تھیں، آج کی حکومتیں جمہوریت اور فرد کی آزادی کی دعویدار بننے کے باوجود انسانوں کو آزادی کا کوئی ایسا گوشہ عطا کرنے پر تیار نہیں ہوتیں جس میں وہ اطمینان کے ساتھ اپنی منشا اور مرضی کے مطابق عمل کر سکیں۔ چنانچہ دَورِ جدید کی انتہائی جمہوری حکومتوں کی گرفت بھی دورِ متوسط کی شہنشاہیت سے کہیں زیادہ مضبوط اور جابرانہ ہے۔

اِس تغیر کا دوسرا اثر ریاست کے دائرہ کی غیر معمولی وسعت ہے۔ آج کی ریاستیں ملک کے اندر اور باہر صرف امن و امان قائم رکھنے کے لیے ہی معرضِ وجود میں نہیں آتیں بلکہ اپنے سامنے بے شمار عزائم رکھتی ہیں اور اُن کی تکمیل کے لیے وہ سلطنت کے حفظ و بقا اور اُس کے اندر نظم و ضبط قائم رکھنے کا انتظام کرتی ہیں۔ آج کی حکومت کا دائرۂ کار اتنا وسیع اور اتنا ہمہ گیر ہے اور اُس کے فرائض اتنے زیادہ اور اُس کی ذمہ داریاں اتنی نازک اور متنوع ہیں کہ ماضی میں اُن کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔

آج کی حکومتیں مخصوص نظریات اور تصورات کی علمبردار بن کر معرضِ وجود میں آئی ہیں اور انہیں نظریات کے مطابق وہ حیاتِ انسانی کی تشکیل کرنے کے لیے جد وجہد کرتی ہیں۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہوتا جسے وہ اپنے بنیادی تصورات کے مطابق ڈھالنے کے لیے اپنا ایک خاص پروگرام نہ رکھتی ہوں۔ یہ چیز اُن کی سلامتی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ نظریاتی ریاستیں اُسی صورت میں زندہ رہ سکتی ہیں جب وہ اپنے سارے ذرائع و وسائل، اور اپنی آبادی کی ساری ذہنی، فکری اور جسمانی قوتوں کو اساسی تصورات کے مطابق ایک راستہ پر لگا دیں اور اگر وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں پوری ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتیں تو ان کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ ریاست کے عزائم اور اس کے دائرۂ عمل کی اس تبدیلی نے موجودہ حکومتوں کو ایسی کلیت پسند ریاستیں بنا دیا جو پوری زندگی پر محیط اور حاوی ہیں۔

فکر و نظر کی اس تبدیلی کے دیگر محرّکات میں ایک محرک وہ مادّی فلسفۂ حیات ہے جس پر اس وقت دنیا کا سارا فکری اور عملی نظام چل رہا ہے۔ تاریخ کے صفحات اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ جب کسی قوم کے قلب و دماغ سے آخرت کی جوابدہی کا احساس مٹتا چلا گیا تو اُس وقت اُس قوم کے افراد کی انفرادیت بالکل ختم ہو کر رہ گئی اور انہیں اجتماعی نظم وضبط کا پابند بنانے اور اُن کی صلاحیتوں کو بزعمِ خود تعمیری کام پر لگانے کے لیے انہیں آئین وضوابط کی بے شمار حدبندیوں میں جکڑنا پڑا۔ چنانچہ دیکھیے کہ یونان اور رُوم کے اندر آخرت کی مسئولیت کا چونکہ کوئی صحیح تصور نہ تھا اس لیے اُن کی "شہری ریاستوں" کا دائرہ کار بھی وسیع تھا۔ پھر مذہب کے عروج کے بعد انسان کے اندر روح کے وجود کا شعور پیدا ہوا اور وہ آخرت کی بازپرس کے خوف سے داخلی محرکات کے تحت اپنی زندگی کو اخلاق کا پابند بنانے لگا تو قوانین کا دائرہ سکڑنے لگا۔ پھر صنعتی انقلاب کے بعد جب مذہب کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ تو احساسِ جوابدہی کے چہرے پر بھی مُردنی چھا گئی اور انسان کی ترقی اور اُس کے نشو ونما کے لیے قوانین کا سہارا

لینا پڑا اور اس طرح ریاست کو اجتماعی زندگی کے مسائل سے بھی کہیں زیادہ آگے بڑھ کر اُن معاملات میں براہِ راست دخیل ہونے کی ضرورت پیش آئی جو انسان کے خالص ذاتی معاملات ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ریاستیں بڑی سرعت کے ساتھ آمریّت کے آغوش میں جا رہی ہیں اور وہ حکومتیں جو جمہوریّت کی دعویدار ہیں اُن میں بھی افراد لاتعداد ناروا پابندیوں میں بہت بُری طرح جکڑے ہوئے ہیں۔

جو قیادت جتنی زیادہ انقلابی اور اجتماعی زندگی میں جتنی سرعت کے ساتھ تبدیلیاں لانے کی آرزومند ہو گی اتنے ہی اس کے عزائم وسیع اور مزاج آمرانہ ہو گا۔ اس اصول کی صحت کا اگر آپ اندازہ لگانا چاہیں تو ذرا چین، جاپان، انڈونیشیا اور مصر کے حالات کا بغور مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ یہاں جمہوریت کی بجائے آمریّت کو کیوں نہایت جبر کے ساتھ مسلّط کیا جا رہا ہے اس کی وجہ اگر معلوم کرنی ہو تو مغرب کے فاضل مفکر آئی۔ آر سینا نے (I.R. SINAI) کی کتاب (THE CHALLENGE OF MODERNIZATION) مطالعہ فرمائیں۔ اس کا خیال یہ ہے کہ اہلِ مشرق ماضی کی روایات کے پابند ہیں اور اُن کی یہ پابندی اُن معاشی اور معاشرتی عزائم کی تکمیل میں حائل ہوتی ہے جو مغربی تہذیب وتمدّن کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اس بنا پر سینا نے اس بات کا قائل ہے کہ مشرق میں مذہب کے نقوش مٹانے کے لیے ضروری ہے کہ یہاں آمریّت کو مستحکم کیا جائے تاکہ اس کے ذریعہ اہلِ ملک کی منشا اور مرضی کے خلاف جبر کے زور سے مغربی تہذیب کو مسلّط کیا جا سکے۔ حکومت کا دائرہ جتنا وسیع اور اُس کی گرفت جتنی مضبوط ہو گی اُسی نسبت سے مادی فلسفۂ حیات اور اس کے نتیجے میں مادی تہذیب کو پروان چڑھانے میں آسانی ہو گی۔

یہ ہیں وہ نامساعد حالات جن میں آج اسلام کے لیے کام کرنے والوں کو (باقی ص ۶۹ پر)

تفہیم القرآن

الشوریٰ

(۴)

جس کو اللہ ہی گمراہی میں پھینک دے اُس کا کوئی سنبھالنے والا اللہ کے بعد نہیں ہے۔[۶۹]
تم دیکھو گے کہ یہ ظالم جب عذاب دیکھیں گے تو کہیں گے اب پلٹنے کی بھی کوئی سبیل ہے؟[۷۰] اور
تم دیکھو گے کہ یہ جہنم کے سامنے جب لائے جائیں گے تو ذلت کے مارے جھکے جا رہے ہوں گے
اور اُس کو نظر بچا بچا کر کن انکھیوں سے دیکھیں گے۔[۷۱] اُس وقت وہ لوگ جو ایمان لائے تھے،

۶۹؎ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے قرآن جیسی بہترین کتاب اِن لوگوں کی ہدایت کے لیے بھیجی جو نہایت معقول اور نہایت مؤثر و دلنشین طریقہ سے اِن کو حقیقت کا علم دے رہی ہے اور زندگی کا صحیح راستہ بتا رہی ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا نبی اِن کی رہنمائی کے لیے بھیجا جس سے بہتر سیرت و کردار کا آدمی کبھی ان کی نگاہوں نے نہ دیکھا تھا۔ اور اِس کتاب اور اِس رسول کی تعلیم و تربیت کے نتائج بھی اللہ نے ایمان لانے والوں کی زندگیوں میں انہیں آنکھوں سے دکھا دیئے۔ اب اگر کوئی شخص یہ سب کچھ دیکھ کر بھی ہدایت سے مُنہ موڑتا ہے تو اللہ پھر اُسی گمراہی میں اُسے پھینک دیتا ہے جس سے نکلنے کا وہ خواہشمند نہیں ہے۔ اور جب اللہ ہی نے اسے اپنے دروازے سے دھتکار دیا تو اب کون یہ ذمہ لے سکتا ہے کہ اسے راہِ راست پر لے آئے گا۔

۷۰؎ یعنی آج جبکہ پلٹ آنے کا موقع ہے، یہ پلٹنے سے انکار کر رہے ہیں۔ کل جب فیصلہ ہو چکے گا اور سزا کا حکم نافذ ہو جائے گا اُس وقت اپنی شامت دیکھ کر یہ چاہیں گے کہ اب انہیں پلٹنے کا موقع ملے۔

۷۱؎ انسان کا قاعدہ ہے کہ جب کوئی ہولناک منظر اُس کے سامنے ہوتا ہے اور وہ جان رہا ہوتا ہے کہ عنقریب وہ اُس بلا کے چنگل میں آنے والا ہے جو سامنے نظر آ رہی ہے، تو پہلے تو ڈر کے مارے وہ آنکھیں بند

کہیں گے کہ واقعی اصل زیاں کار وہی ہیں جنہوں نے آج قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے متعلقین کو خسارے میں ڈال دیا۔ خبردار رہو، ظالم لوگ مستقل عذاب میں ہونگے اور ان کے کوئی حامی و سرپرست نہ ہونگے جو اللہ کے مقابلے میں ان کی مدد کو آئیں۔ جسے اللہ گمراہی میں پھینک دے اس کے لیے بچاؤ کی کوئی سبیل نہیں۔

مان لو اپنے رب کی بات قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس کے ٹلنے کی کوئی صورت اللہ کی طرف سے نہیں ہے[۷۲]۔ اُس دن تمہارے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی اور نہ کوئی تمہارے حال کو بدلنے کی کوشش کرنے والا ہوگا[۷۳]۔ اب اگر یہ لوگ مُنہ موڑتے ہیں تو اے نبی، ہم نے تم کو ان پر نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجا ہے[۷۴]۔ تم پر تو صرف بات پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ انسان کا حال یہ ہے کہ جب ہم اسے اپنی رحمت کا مزا چکھاتے ہیں تو پھول جاتا ہے، اور اگر اس کے اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا کسی مصیبت کی شکل میں اُس پر اُلٹ پڑتا ہے تو سخت ناشکرا بن جاتا ہے[۷۵]۔

کر لیتا ہے۔ پھر اس سے رہا نہیں جاتا۔ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ بلا کیسی ہے اور ابھی اُس سے کتنی دُور ہے۔ لیکن اِس کی بھی ہمت نہیں پڑتی کہ سر اٹھا کر نگاہ بھر کر اسے دیکھے۔ اس لیے وہ بار بار ذرا سی آنکھیں کھول کر اسے گوشۂ چشم سے دیکھتا ہے اور پھر ڈر کے مارے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ جہنم کی طرف جانے والوں کی اسی کیفیت کا نقشہ اس آیت میں کھینچا گیا ہے۔

۷۲۔ یعنی نہ اللہ خود اُسے ٹالے گا اور نہ کسی دوسرے میں یہ طاقت ہے کہ اسے ٹال سکے۔

۷۳۔ اصل الفاظ ہیں مَا لَكُم مِّن نَّكِيرٍ۔ اِس فقرے کے کئی مفہوم اور بھی ہیں۔ ایک یہ کہ تم اپنے کرتوتوں میں سے کسی کا انکار نہ کر سکو گے۔ دوسرے یہ کہ تم بھیس بدل کر کہیں چھُپ نہ سکو گے۔ تیسرے یہ کہ تمہارے ساتھ جو کچھ بھی کیا جائے گا اُس پر تم کوئی احتجاج اور اظہار ناراضی نہ کر سکو گے۔ چوتھے یہ کہ تمہارے بس میں یہ نہ ہوگا کہ جس حالت میں تم مبتلا کیے گئے ہو اسے بدل سکو۔

۷۴۔ یعنی تمہارے اُوپر یہ ذمہ داری تو نہیں ڈالی گئی ہے کہ تم انہیں ضرور راہ راست ہی پر لا کے رہو اور نہ اس بات کی تم سے کوئی بازپرس ہونی ہے کہ یہ لوگ کیوں راہ راست پہ نہ آئے۔

اللہ زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے[۷۶]، جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے دیتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکے اور لڑکیاں ملا جُلا کر دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے بانجھ کر دیتا ہے۔ وہ سب کچھ جانتا اور ہر چیز پر قادر ہے[۷۷]۔

---

[۷۵] انسان سے مراد یہاں وہ چھچھورے اور کم ظرف لوگ ہیں جن کا اوپر سے ذکر چلا آرہا ہے جنہیں دنیا کا کچھ رزق مل گیا ہے تو اس پر پھولے نہیں سماتے اور سمجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے تو سن کر نہیں دیتے۔ لیکن اگر کسی وقت اپنے ہی کرتوتوں کی بدولت ان کی شامت آجاتی ہے تو قسمت کو رونا شروع کر دیتے ہیں، اور ان ساری نعمتوں کو بھول جاتے ہیں جو اللہ نے انہیں دی ہیں اور کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ جس حالت میں وہ مبتلا ہوتے ہیں اس میں ان کا اپنا کیا قصور ہے۔ اس طرح نہ خوشحالی ان کی اصلاح میں مددگار ہوتی ہے، نہ بدحالی ہی انہیں سبق دے کر راہِ راست پر لاسکتی ہے۔ سلسلۂ کلام کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوجاتا ہے کہ دراصل یہ ان لوگوں کے رویّے پر طنز ہے جو اوپر کی تقریر کے مخاطب تھے۔ مگر ان کو خطاب کر کے یہ نہیں کہا گیا کہ تمہارا حال یہ ہے، بلکہ بات یوں کہی گئی کہ انسان میں عام طور پر یہ کمزوری پائی جاتی ہے اور یہی اس کے بگاڑ کا اصل سبب ہے۔ اس سے حکمتِ تبلیغ کا یہ نکتہ ہاتھ آتا ہے کہ مخاطب کی کمزوریوں پر براہِ راست چوٹ نہیں کرنی چاہیے، بلکہ عمومی انداز میں ان کا ذکر کرنا چاہیے تاکہ وہ چڑ نہ جائے، اور اس کے ضمیر میں اگر کچھ بھی زندگی باقی ہے تو ٹھنڈے دل سے اپنے عیب کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

[۷۶] یعنی کفر و شرک کی حماقت میں جو لوگ مبتلا ہیں وہ اگر سمجھانے سے نہیں مانتے تو نہ مانیں، حقیقت اپنی جگہ حقیقت ہے۔ زمین و آسمان کی بادشاہی دنیا کے نام نہاد بادشاہوں اور جباروں اور سرداروں کے حوالے نہیں کر دی گئی ہے، نہ کسی نبی یا ولی یا دیوی اور دیوتا کا اس میں کوئی حصہ ہے، بلکہ اس کا مالک اکیلا اللہ تعالیٰ ہے۔ اس سے بغاوت کرنے والا نہ اپنے بل بوتے پر جیت سکتا ہے، نہ ان ہستیوں میں سے کوئی آکر اسے بچا سکتی ہے جنہیں لوگوں نے اپنی حماقت سے خدائی اختیارات کا مالک سمجھ رکھا ہے۔

[۷۷] یہ اللہ کی بادشاہی کے مطلق (ABSOLUTE) ہونے کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے۔ کوئی

[۷۸]کسی بشر کا یہ مقام نہیں ہے کہ اللہ اُس سے رُوبرو بات کرے۔ اُس کی بات یا تو وحی (اشارے) کے طور پر ہوتی ہے[۷۹]، یا پردے کے پیچھے سے[۸۰]، یا پھر وہ کوئی پیغام بر (فرشتہ) بھیجتا ہے اور وہ اُس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے، وحی کرتا ہے[۸۱]۔ وہ برتر اور حکیم ہے[۸۲]۔ اور اسی طرح (اے محمدؐ) ہم نے اپنے

انسان، خواہ وہ بڑے سے بڑے دنیوی اقتدار کا مالک بنا پھرتا ہو، یا روحانی اقتدار کا مالک سمجھا جاتا ہو، کبھی اس پر قادر نہیں ہو سکا ہے کہ دوسروں کو اولاد دلوانا تو درکنار، خود اپنے ہاں اپنی خواہش کے مطابق اولاد پیدا کر سکے۔ جسے خدا نے بانجھ کر دیا وہ کسی دوا اور کسی علاج اور کسی تعویذ گنڈے سے اولاد والا نہ بن سکا۔ جسے خدا نے لڑکیاں ہی لڑکیاں دیں وہ ایک بیٹا بھی کسی تدبیر سے حاصل نہ کر سکا، اور جسے خدا نے لڑکے ہی لڑکے دیئے وہ ایک بیٹی بھی کسی طرح نہ پا سکا۔ اس معاملہ میں ہر ایک قطعی بے بس رہا ہے، بلکہ بچے کی پیدائش سے پہلے کوئی یہ تک نہ معلوم کر سکا کہ رحم مادر میں لڑکا پرورش پا رہا ہے یا لڑکی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اگر کوئی خدائی میں مختار کل ہونے کا زعم کرے، یا کسی دوسری ہستی کو اختیارات میں دخیل سمجھے تو یہ اس کی اپنی ہی بے بصیرتی ہے جس کا خمیازہ وہ خود بھگتے گا۔ کسی کے اپنی جگہ کچھ سمجھ بیٹھنے سے حقیقت میں ذرہ برابر بھی تغیر واقع نہیں ہوتا۔

[۷۸] تقریر ختم کرتے ہوئے اُسی مضمون کو پھر لیا گیا ہے جو آغاز کلام میں ارشاد ہوا تھا۔ بات کو پوری طرح سمجھنے کے لیے اس سورہ کی پہلی آیت اور اس کے حاشیے پر دوبارہ ایک نگاہ ڈال لیجیے۔

[۷۹] یہاں وحی سے مراد ہے القاء، الہام، دل میں کوئی بات ڈال دینا، یا خواب میں کچھ دکھا دینا جیسے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یوسفؑ کو دکھایا گیا (یوسف آیات ۴-۱۰۰۔ الصافات ۱۰۲)۔

[۸۰] مراد یہ ہے کہ بندہ ایک آواز سنے، مگر بولنے والا اُسے نظر نہ آئے۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کے ساتھ ہوا کہ طور کے دامن میں ایک درخت سے یکایک انہیں آواز آنی شروع ہوئی مگر بولنے والا ان کی نگاہ سے اوجھل تھا (طٰہٰ۔ آیات ۱۱ تا ۴۸۔ النمل۔ آیات ۸ تا ۱۲۔ القصص۔ آیات ۳۰ تا ۳۵)

[۸۱] یہ وحی کے آنے کی وہ صورت ہے جس کے ذریعہ سے تمام کتب آسمانی انبیاء علیہم السلام تک پہنچی ہیں۔ بعض لوگوں نے اس فقرے کی غلط تاویل کر کے اس کو یہ معنی پہنائے ہیں کہ "اللہ کوئی رسول بھیجتا ہے جو اس کے حکم سے عام لوگوں تک اُس کا پیغام پہنچاتا ہے"۔ لیکن قرآن کے الفاظ فَيُوحِيَ بِإِذْنِهِ مَا يَشَاءُ

حکم سے ایک روح تمہاری طرف وحی کی ہے[۸۳] تمہیں کچھ پتہ نہ تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور ایمان

(پھر وہ وحی کرتا ہے اُس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے)، اُن کی اِس تاویل کا غلط ہونا بالکل عیاں کر دیتے ہیں۔ عام انسانوں کے سامنے انبیاء کی تبلیغ کو "وحی کرنے" سے نہ قرآن میں کہیں تعبیر کیا گیا ہے اور نہ عربی زبان میں انسان کی انسان سے علانیہ گفتگو کو "وحی" کے لفظ سے تعبیر کرنے کی کوئی گنجائش ہے۔ لغت میں وحی کے معنی ہی خفیہ اور سریع اشارے کے ہیں۔ انبیاء کی تبلیغ پر اِس لفظ کا اطلاق صرف وہی شخص کر سکتا ہے جو عربی زبان سے بالکل نابلد ہو۔

۸۲؎ یعنی وہ اِس سے بہت بالا و برتر ہے کہ کسی بشر سے رُو در رو کلام کرے۔ اور اس کی حکمت اِس سے عاجز نہیں ہے کہ اپنے کسی بندے تک اپنی ہدایات پہنچانے کے لیے رُو برو بات چیت کرنے کے سوا کوئی اور تدبیر نکال لے۔

۸۳؎ "اِسی طرح" سے مراد محض آخری طریقہ نہیں ہے بلکہ وہ تینوں طریقے ہیں جو اوپر کی آیات میں مذکور ہوئے ہیں، اور "روح" سے مراد وحی، یا وہ تعلیم ہے جو وحی کے ذریعہ سے حضورؐ کو دی گئی۔ یہ بات قرآن اور حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اِن تینوں طریقوں سے ہدایات دی گئی ہیں:-

(۱) حدیث میں حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آنے کی ابتدا ہی سچے خوابوں سے ہوئی تھی (بخاری و مسلم)۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا ہے، چنانچہ احادیث میں آپؐ کے بہت سے خوابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں آپ کو کوئی تعلیم دی گئی ہے یا کسی بات پر مطلع کیا گیا ہے، اور قرآن مجید میں بھی آپؐ کے ایک خواب کا صراحت کے ساتھ ذکر آیا ہے (الفتح۔ آیت ۲۷)۔ اس کے علاوہ متعدد احادیث میں یہ ذکر بھی آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا، فلاں بات میرے دل میں ڈالی گئی ہے، یا مجھے بتایا گیا ہے، یا مجھے یہ حکم دیا گیا ہے، یا مجھے اس سے منع کیا گیا ہے۔ ایسی تمام چیزیں وحی کی پہلی قسم سے تعلق رکھتی ہیں، اور احادیثِ قدسیہ بھی زیادہ تر اسی قبیل سے ہیں۔

(۲) معراج کے موقع پر حضورؐ کو وحی کی دوسری قسم سے بھی مشرف فرمایا گیا۔ متعدد صحیح احادیث

کیا ہوتا ہے[۸۴]۔ مگر اُس رُوح کو ہم نے ایک روشنی بنا دیا جس سے ہم راہ دکھاتے ہیں اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں۔ یقیناً تم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کر رہے ہو، اُس خدا کے راستے کی طرف جو زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کا مالک ہے۔ خبردار رہو، سارے معاملات اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں[۸۵]۔ ع ۵

میں حضوؐر کو پنجوقتہ نماز کا حکم دیے جانے، اور حضوؐر کے اُس پر بار بار عرض معروض کرنے کا ذکر جس طرح آیا ہے اُس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت اللہ اور اُس کے بندے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ویسا ہی مکالمہ ہوا تھا جیسا دامنِ طور میں حضرت موسیٰ اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوا۔

(۳) رہی تیسری قسم تو اُس کے متعلق قرآن خود ہی شہادت دیتا ہے کہ اسے جبریل امین کے ذریعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا گیا ہے (البقرہ-۹۷۔ الشعراء ۱۹۲ تا ۱۹۵)

[۸۴] یعنی نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے کبھی حضوؐر کے ذہن میں یہ تصوّر تک نہ آیا تھا کہ آپ کو کوئی کتاب ملنے والی ہے، یا ملنی چاہیے، بلکہ آپ سرے سے کتبِ آسمانی اور ان کے مضامین کے متعلق کچھ جانتے ہی نہ تھے۔ اسی طرح آپ کو اللہ پر ایمان تو ضرور حاصل تھا، مگر آپ نہ شعوری طور پر اِس تفصیل سے واقف تھے کہ انسان کو اللہ کے متعلق کیا کیا باتیں ماننی چاہییں، اور نہ آپ کو یہ معلوم تھا کہ اس کے ساتھ ملائکہ اور نبوت اور کتبِ الٰہی اور آخرت کے متعلق بھی بہت سی باتوں کا ماننا ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں ایسی تھیں جو خود کفارِ مکہ سے بھی چھپی ہوئی نہ تھیں۔ مکہ معظمہ کا کوئی شخص یہ شہادت نہ دے سکتا تھا کہ اس نے نبوت کے اچانک اعلان سے پہلے کبھی حضور کی زبان سے کتابِ الٰہی کا کوئی ذکر سنا ہو، یا آپ سے اس طرح کی کوئی بات سنی ہو کہ لوگوں کو فلاں فلاں چیزوں پر ایمان لانا چاہیے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی شخص پہلے سے خود نبی بن بیٹھنے کی تیاری کر رہا ہو تو اس کی یہ حالت تو کبھی نہیں ہو سکتی کہ چالیس سال تک اس کے ساتھ شب و روز کا میل جول رکھنے والے اس کی زبان سے کتاب اور ایمان کا لفظ تک نہ سنیں، اور چالیس سال کے بعد یکایک وہ انہی موضوعات پر دھواں دھار تقریریں کرنے لگے

[۸۵] یہ آخری تنبیہ ہے جو کفار کو دی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبی نے کہا اور تم نے سن کر رد کر دیا، اس پر بات ختم نہیں ہو جاتی ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اللہ کے حضور پیش ہوتا ہے اور آخرکار اسی کے دربار سے یہ فیصلہ ہونا ہے کہ کس کا کیا انجام ہونا چاہیے۔

تفہیم القرآن

الزُّخرُف

نام آیت ۳۵ کے لفظ وَزُخرُفًا سے ماخوذ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ سورہ جس میں لفظ زُخرُف آیا ہے۔

زمانۂ نزول کسی معتبر روایت سے معلوم نہیں ہو سکا ہے۔ لیکن اس کے مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ سورہ بھی اُسی زمانے میں نازل ہوئی ہے جس میں المومن، حٰم السجدہ اور الشوریٰ نازل ہوئیں۔ یہ ایک ہی سلسلے کی سورتیں معلوم ہوتی ہیں جن کا نزول اُس وقت سے شروع ہوا جب کفارِ مکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے ہو گئے تھے، شب و روز اپنی محفلوں میں بیٹھ بیٹھ کر مشورے کر رہے تھے کہ آپ کو کس طرح ختم کیا جائے، اور ایک حملہ آپ کی جان پر ہو بھی چکا تھا۔ اِس صورت حال کی طرف آیات ۷۹-۸۰ میں صاف اشارہ موجود ہے۔

موضوع اور مباحث اِس سورے میں پورے زور کے ساتھ قریش اور اہلِ عرب کے اُن جاہلانہ عقائد و اوہام پر تنقید کی گئی ہے جن پر وہ اصرار کیے چلے جا رہے تھے، اور نہایت محکم و دل نشین طریقے سے ان کی نامعقولیت کا پردہ فاش کیا گیا ہے، تاکہ معاشرے کا ہر فرد، جس کے اندر کچھ بھی معقولیت موجود ہو، یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ آخر یہ کیسی جہالتیں ہیں جن سے ہماری قوم بُری طرح چمٹی ہوئی ہے، اور جو شخص ہمیں اِن کے چکر سے نکالنے کی کوشش کر رہا ہے اُس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے۔

کلام کا آغاز اس طرح کیا گیا ہے کہ تم لوگ اپنی شرارتوں کے بل پر یہ چاہتے ہو کہ اس کتاب کا نزول روک دیا جائے، مگر اللہ نے کبھی اشرار کی وجہ سے انبیاء کی بعثت اور کتابوں کی تنزیل نہیں روکی ہے، بلکہ اُن ظالموں کو ہلاک کر دیا ہے جو اس کی ہدایت کا راستہ روک کر کھڑے ہوئے تھے۔ یہی کچھ وہ اب بھی کرے گا۔ آگے چل کر آیات ۴۱۔۴۴ اور ۷۹۔۸۰ میں یہ مضمون پھر دُہرایا گیا ہے۔ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کے درپے تھے ان کو سناتے ہوئے حضورؐ سے فرمایا گیا ہے کہ تم خواہ زندہ رہو یا نہ رہو، اِن ظالموں کو ہم سزا دے کر رہیں گے۔ اور خود اُن لوگوں کو صاف صاف متنبہ کر دیا گیا ہے کہ اگر تم نے ہمارے نبی کے خلاف ایک اقدام کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم بھی پھر ایک فیصلہ کن قدم اٹھائیں گے۔

اِس کے بعد بتایا گیا ہے کہ وہ مذہب کیا ہے جسے یہ لوگ سینے سے لگائے ہوئے ہیں، اور وہ دلائل کیا ہیں جن کے بل بوتے پر یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ کر رہے ہیں:

خود مانتے ہیں کہ زمین و آسمان کا، اور اِن کا اپنا اور اِن کے معبودوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ یہ بھی جانتے اور مانتے ہیں کہ جن نعمتوں سے یہ فائدہ اٹھا رہے ہیں وہ سب اللہ کی دی ہوئی ہیں۔ پھر بھی دوسروں کو اللہ کے ساتھ خدائی میں شریک کرنے پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں۔

بندوں کو اللہ کی اولاد قرار دیتے ہیں۔ اور اولاد بھی بیٹیاں جنہیں خود اپنے لیے ننگ و عار سمجھتے ہیں۔

فرشتوں کو انہوں نے دیویاں قرار دے رکھا ہے۔ اُن کے بُت عورتوں کی شکل کے بنا رکھے ہیں۔ انہیں زنانہ کپڑے اور زیور پہناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اُن کی عبادت کرتے ہیں اور اُنہی سے منتیں اور مُرادیں مانگتے ہیں۔ آخر انہیں کیسے معلوم ہوا کہ فرشتے عورتیں ہیں؟

اِن بہتانوں پر ٹوکا جاتا ہے تو تقدیر کا بہانہ پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر اللہ

ہمارے اِس کام کو پسند نہ کرتا تو ہم کیسے اِن بتوں کی پرستش کر سکتے تھے۔ حالانکہ اللہ کی پسند اور ناپسند معلوم ہونے کا ذریعہ اُس کی کتابیں ہیں، نہ کہ وہ کام جو دنیا میں اس کی مشیّت کے تحت ہو رہے ہیں۔ مشیّت کے تحت تو ایک بُت پرستی ہی نہیں، چوری، ڈاکہ، زنا، قتل، سب ہی کچھ ہو رہا ہے۔ کیا اس دلیل سے ہر اُس برائی کو جائز و برحق قرار دیا جائے گا جو دنیا میں ہو رہی ہے؟

پوچھا جاتا ہے کہ اپنے اِس شرک کے لیے تمہارے پاس اِس غلط دلیل کے سوا کوئی اور سند بھی ہے، تو جواب دیتے ہیں کہ باپ دادا سے یہ کام یونہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ گویا اِن کے نزدیک کسی مذہب کے حق ہونے کے لیے یہ کافی دلیل ہے۔ حالانکہ ابراہیم علیہ السلام جن کی اولاد ہونے پر ہی اِن کے سارے فخر و امتیاز کا مدار ہے، باپ دادا کے مذہب کو لات مار کر گھر سے نکل گئے تھے اور اُنہوں نے اسلاف کی ایسی اندھی تقلید کو رَد کر دیا تھا جس کا ساتھ کوئی دلیلِ معقول نہ دیتی ہو۔ پھر اگر اِن لوگوں کو اسلاف کی تقلید ہی کرنی تھی تو اس کے لیے بھی اپنے بزرگ ترین اسلاف، ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کو چھوڑ کر انہوں نے اپنے جاہل ترین اسلاف کا انتخاب کیا!

اِن سے کہا جاتا ہے کہ کیا کبھی کسی نبی نے اور خدا کی طرف سے آئی ہوئی کسی کتاب نے بھی یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کے ساتھ دوسرے بھی عبادت کے مستحق ہیں، تو یہ عیسائیوں کے اس فعل کو دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے عیسیٰؑ ابنِ مریم کو ابنُ اللہ مانا اور ان کی پرستش کی۔ حالانکہ سوال یہ نہ تھا کہ کسی نبی کی امت نے شرک کیا ہے یا نہیں، بلکہ یہ تھا کہ خود کسی نبی نے شرک کی تعلیم دی ہے؟ عیسیٰ ابنِ مریمؑ نے کب کہا تھا کہ مَیں خدا کا بیٹا ہوں اور تم میری عبادت کرو۔ ان کی اپنی تعلیم تو وہی تھی جو دنیا کے ہر نبی نے دی ہے کہ میرا رب بھی اللہ ہے اور تمہارا رب بھی، اسی کی تم عبادت کرو۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کرنے میں انہیں تامّل ہے تو اِس بنا پر کہ ان کے

پاس مال و دولت اور ریاست وجاہت تو ہے ہی نہیں۔ کہتے ہیں کہ اگر خدا ہمارے ہاں کسی کو نبی بنانا چاہتا تو ہمارے دونوں شہروں (مکہ وطائف) کے بڑے آدمیوں میں سے کسی کو بناتا۔ اسی بنا پر فرعون نے بھی حضرت موسیٰ کو حقیر جانا تھا اور کہا تھا کہ آسمان کا بادشاہ اگر مجھ زمین کے بادشاہ کے پاس کوئی ایلچی بھیجتا تو اسے سونے کے کنگن پہنا کر، فرشتوں کی ایک فوج اس کی اردلی میں دے کر بھیجتا۔ یہ فقیر کہاں سے آکھڑا ہوا؟ فضیلت مجھے حاصل ہے کہ مصر کی بادشاہی میری ہے اور دریائے نیل کی نہریں میری ماتحتی میں چل رہی ہیں۔ یہ شخص میرے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے کہ نہ مال رکھتا ہے نہ اقتدار۔

اِس طرح کفار کی ایک ایک جاہلانہ بات پر تنقید کرنے اور اس کے نہایت معقول و مدلل جوابات دینے کے بعد آخر میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ نہ خدا کی کوئی اولاد ہے، نہ آسمان و زمین کے خدا الگ الگ ہیں، نہ اللہ کے ہاں کوئی ایسا شفیع ہے جو جان بوجھ کر گمراہی اختیار کرنے والوں کو اُس کی سزا سے بچا سکے۔ اللہ کی ذات اس سے منزّہ ہے کہ کوئی اس کی اولاد ہو۔ وہی اکیلا ساری کائنات کا خدا ہے، باقی سب اس کے بندے ہیں نہ کہ اس کے ساتھ خدائی صفات و اختیارات میں شریک۔ اور شفاعت اس کے ہاں صرف وہی کر سکتے ہیں جو خود حق پرست ہوں، اور انہی کے لیے کر سکتے ہیں جنہوں نے دنیا میں حق پرستی اختیار کی ہو۔

اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے

حٰم قسم ہے اِس واضح کتاب کی کہ ہم نے اِسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم لوگ اِسے سمجھو[۱]۔ اور درحقیقت یہ اُمّ الکتاب میں ثبت ہے[۲]، ہمارے ہاں بڑی بلند مرتبہ اور حکمت سے

[۱] قرآن مجید کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اِس کتاب کے مصنف "ہم" ہیں نہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور قسم کھانے کے لیے قرآن کی جس صفت کا انتخاب کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کتابِ مُبین ہے۔ اس صفت کے ساتھ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر خود قرآن کی قسم کھانا آپ سے آپ یہ معنی دے رہا ہے کہ لوگو، یہ کھلی کتاب تمہارے سامنے موجود ہے، اِسے آنکھیں کھول کر دیکھو، اس کے صاف صاف غیر مُبہم مضامین، اِس کی زبان، اس کا ادب، اس کی حق و باطل کے درمیان ایک واضح خطِ امتیاز کھینچ دینے والی تعلیم، یہ ساری چیزیں اِس حقیقت کی صریح شہادت دے رہی ہیں کہ اس کا مُصنّف خداوندِ عالم کے سوا کوئی دوسرا ہو نہیں سکتا۔

پھر یہ جو فرمایا کہ "ہم نے اِسے عربی زبان کا قرآن بنایا ہے تاکہ تم اِسے سمجھو"، اِس کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ یہ کسی غیر زبان میں نہیں ہے، بلکہ تمہاری اپنی زبان میں ہے، اس لیے اسے جانچنے پرکھنے اور اِس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں تمہیں کوئی دقت پیش نہیں آسکتی۔ یہ کسی عجمی زبان میں ہوتا تو تم یہ عذر کرسکتے تھے کہ ہم اس کے کلامِ الٰہی ہونے یا نہ ہونے کی جانچ کیسے کریں جبکہ ہماری سمجھ ہی میں یہ نہیں آرہا ہے۔ لیکن اس عربی قرآن کے متعلق تم یہ عذر کیسے کرسکتے ہو۔ اِس کا ایک ایک لفظ تمہارے لیے واضح ہے۔ اس کی ہر عبارت اپنی زبان اور اپنے مضمون، دونوں کے لحاظ سے تم پر روشن ہے۔ خود دیکھ لو کہ کیا یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یا کسی عرب کا کلام ہوسکتا ہے۔ دوسرا مطلب اِس ارشاد کا یہ ہے کہ اِس کتاب کی زبان ہم نے عربی اِس لیے رکھی ہے کہ ہم عرب قوم کو مخاطب کر رہے ہیں اور وہ عربی زبان کے قرآن ہی کو سمجھ سکتی ہے۔ عربی میں قرآن نازل کرنے کی اِس صریح معقول وجہ کو نظر انداز کرکے جو شخص صرف اِس بنا پر اسے کلامِ الٰہی کے بجائے کلامِ محمدؐ قرار دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مادری زبان بھی عربی ہے تو وہ بڑی زیادتی کرتا ہے۔ اس دوسرے مطلب کو سمجھنے کے لیے تفہیم القرآن، جلد چہارم، سورۂ حٰم السجدہ، آیت ۴۴ مع حاشیہ ۵۴ ملاحظہ فرمائیں۔

لبریز کتاب ہے۳ے۔

ے۲ "اُمّ الکتاب" سے مراد ہے "اصلُ الکتاب"، یعنی وہ کتاب جس سے تمام انبیاء علیہم السلام پر نازل ہونے والی کتابیں ماخوذ ہیں۔ اسی کو سورۂ واقعہ میں کِتَابٌ مَّکْنُوْنٌ (پوشیدہ اور محفوظ کتاب) کہا گیا ہے، اور سورۂ بروج میں اس کے لیے لوحِ محفوظ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، یعنی ایسی لوح جس کا لکھا مٹ نہیں سکتا اور جو ہر قسم کی دراندازی سے محفوظ ہے۔ قرآن کے متعلق یہ فرما کر کہ یہ "اُمّ الکتاب" میں ہے ایک اہم حقیقت پر متنبہ فرمایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف زمانوں میں مختلف ملکوں اور قوموں کی ہدایت کے لیے مختلف انبیاء پر مختلف زبانوں میں کتابیں نازل ہوتی رہی ہیں، مگر اُن سب میں دعوت ایک ہی عقیدے کی طرف دی گئی ہے۔ حق ایک ہی سچائی کو قرار دیا گیا ہے، خیر و شر کا ایک ہی معیار پیش کیا گیا ہے، اخلاق و تہذیب کے یکساں اصول بیان کیے گئے ہیں اور فی الجملہ ایک ہی دین ہے جسے یہ سب کتابیں لے کر آئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان سب کی اصل ایک ہے اور صرف عبارتیں مختلف ہیں۔ ایک ہی معنی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک بنیادی کتاب میں ثبت ہیں اور جب کبھی ضرورت پیش آئی ہے، اُس نے کسی نبی کو مبعوث کر کے وہ معنی حال اور موقع کی مناسبت سے ایک خاص عبارت اور خاص زبان میں نازل فرما دیے ہیں۔ اگر بالفرض اللہ تعالیٰ کا فیصلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب کے بجائے کسی اور قوم میں پیدا کرنے کا ہوتا تو یہی قرآن وہ حضورؐ پر اسی قوم کی زبان میں نازل کرتا۔ اُس میں بات اُسی قوم اور ملک کے حالات کے لحاظ سے کی جاتی، عبارتیں کچھ اور ہوتیں، زبان بھی دوسری ہوتی، لیکن بنیادی طور پر تعلیم و ہدایت یہی ہوتی، اور وہ یہی قرآن ہوتا اگرچہ قرآن عربی نہ ہوتا۔ اسی مضمون کو سورۂ شعراء میں یوں ادا کیا گیا ہے وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ . . . بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ (۱۹۲-۱۹۶) "یہ رب العٰلمین کی نازل کردہ کتاب ہے . . . صاف صاف عربی زبان میں، اور یہ اگلے لوگوں کی کتابوں میں بھی موجود ہے"۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحات ۵۳۴-۵۳۵)

ے۳ اس فقرے کا تعلق کتابِ مُبین سے بھی ہے، اور اُمّ الکتاب سے بھی۔ یعنی یہ تعریف

اب کیا ہم تم سے بیزار ہو کر یہ درسِ نصیحت تمہارے ہاں بھیجنا چھوڑ دیں صرف اس لیے کہ تم حد سے گزرے ہوئے لوگ ہو؟ پہلے گزری ہوئی قوموں میں بھی بارہا ہم نے نبی بھیجے ہیں۔

قرآن کی بھی ہے اور اُس اصل کتاب کی بھی جس سے قرآن منقول یا ماخوذ ہے۔ اِس تعریف سے یہ بات ذہن نشین کرنی مقصود ہے کہ کوئی شخص اپنی نادانی سے اِس کتاب کی قدر و منزلت نہ پہچانے اور اس کی حکیمانہ تعلیم سے فائدہ نہ اٹھائے تو یہ اُس کی اپنی بدقسمتی ہے۔ کوئی اگر اس کی حیثیت کو گرانے کی کوشش کرے اور اس کی باتوں میں کیڑے ڈالے تو یہ اس کی اپنی رذالت ہے۔ کسی کی ناقدری سے یہ بے قدر نہیں ہو سکتی، اور کسی کے خاک ڈالنے سے اِس کی حکمت چھُپ نہیں سکتی۔ یہ تو بجائے خود ایک بلند مرتبہ کتاب ہے جسے اس کی بے نظیر تعلیم، اُس کی معجزانہ بلاغت، اُس کی بے عیب حکمت اور اس کے عالی شان مصنّف کی شخصیت نے بلند کیا ہے۔ یہ کسی کے گرائے کیسے گر جائے گی۔ آگے چل کر آیت ۴۴ میں قریش کو خاص طور پر اور اہلِ عرب کو بالعموم یہ بتایا گیا ہے کہ جس کتاب کی تم اِس طرح ناقدری کر رہے ہو اُس کے نزول نے تم کو ایک بہت بڑے شرف کا موقع عطا کیا ہے جسے اگر تم نے کھو دیا تو خدا کے سامنے تمہیں سخت جوابدہی کرنی ہو گی۔ (ملاحظہ ہو حاشیہ ۳۹)

سے اِس ایک فقرے میں وہ پوری داستان سمیٹ دی گئی ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کے اعلانِ نبوت کے وقت سے لیکر اِن آیات کے نزول تک پچھلے چند برس میں ہو گزری تھی۔ یہ فقرہ ہمارے سامنے یہ تصویر کھینچتا ہے کہ ایک قوم صدیوں سے سخت جہالت، پستی اور بدحالی میں مبتلا ہے یکایک اللہ تعالیٰ کی نظرِ عنایت اُس پر ہوتی ہے۔ وہ اس کے اندر ایک بہترین رہنما اٹھاتا ہے اور اُسے جہالت کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے خود اپنا کلام نازل کرتا ہے، تاکہ وہ غفلت سے بیدار ہو، جاہلانہ اوہام کے چکر سے نکلے اور حقیقت سے آگاہ ہو کر زندگی کا صحیح راستہ اختیار کرلے۔ مگر اُس قوم کے نادان لوگ اور اس کے خود غرض قبائلی سردار اُس رہنما کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہیں اور اسے ناکام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ جوں جوں سال پر سال گزرتے جاتے ہیں، ان کی عداوت اور شرارت بڑھتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ اُسے قتل کر دینے کی ٹھان لیتے ہیں۔ اِس حالت میں

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی نبی اُن کے ہاں آیا ہو اور انہوں نے اُس کا مذاق نہ اُڑایا ہو۔[۵] پھر جو لوگ اِن سے بدرجہا زیادہ طاقت ور تھے اُنہیں ہم نے ہلاک کر دیا، پچھلی قوموں کی مثالیں گزر چکی ہیں[۶]۔

اگر تم اِن لوگوں سے پوچھو کہ زمین اور آسمانوں کو کس نے پیدا کیا ہے تو یہ خود کہیں گے کہ انہیں اُسی زبردست علیم ہستی نے پیدا کیا ہے۔ وہی نا جس نے تمہارے لیے اس زمین کو گہوارہ بنایا[۷]

ارشاد ہو رہا ہے کہ کیا تمہاری اس نالائقی کی وجہ سے ہم تمہاری اصلاح کی کوشش چھوڑ دیں؟ اِس ذِکرِ نصیحت کا سلسلہ روک دیں؟ اور تمہیں اُسی پستی میں پڑا رہنے دیں جس میں تم صدیوں سے گرے ہوئے ہو؟ کیا تمہارے نزدیک واقعی ہماری رحمت کا تقاضا یہی ہونا چاہیے؟ تم نے کچھ سوچا بھی کہ خدا کے فضل کو ٹھکرانا اور حق سامنے آجانے کے بعد باطل پر اصرار کرنا تمہیں کس انجام سے دوچار کرے گا؟

۵ یعنی یہ بیہودگی اگر نبی اور کتاب کے بھیجنے میں مانع ہوتی تو کسی قوم میں بھی کوئی نبی نہ آتا، نہ کوئی کتاب بھیجی جاتی۔

۶ یعنی خاص لوگوں کی بیہودگی کا نتیجہ یہ کبھی نہیں ہوا کہ پوری نوعِ انسانی کو نبوت اور کتاب کی رہنمائی سے محروم کر دیا جاتا، بلکہ اِس کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ جو لوگ باطل پرستی کے نشے اور اپنی قوت کے گھمنڈ میں بدمست ہو کر انبیاء کا مذاق اُڑانے سے باز نہ آئے انہیں آخر کار تباہ کر دیا گیا۔ پھر جب اللہ کا قہر ٹوٹ پڑا تو جس قوت کے بل پر یہ قریش کے چھوٹے چھوٹے سردار اکڑ رہے ہیں اُس سے ہزاروں گُنی زیادہ طاقت رکھنے والے بھی مچھر اور پسو کی طرح مسل کر رکھ دیئے گئے۔

۷ دوسرے مقامات پر تو زمین کو فرش سے تعبیر کیا گیا ہے، مگر یہاں اس کے لیے گہوارے کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ یعنی جس طرح ایک بچہ اپنے پنگھوڑے میں آرام سے لیٹا ہوتا ہے، ایسے آرام کی جگہ تمہارے لیے اِس عظیم الشان کرّے کو بنا دیا جو فضا میں معلق ہے۔ جو ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنے محور پر گھوم رہا ہے۔ جو ۶۶۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے رواں دواں ہے۔ جس کے پیٹ میں وہ آگ بھری ہے کہ پتھروں کو پگھلا دیتی ہے اور آتش فشانوں کی شکل میں لاوا اُگل کر کبھی کبھی نہیں بھی اپنی شان

اور اس میں تمہاری خاطر راستے بنا دیئے[۸] تاکہ تم اپنی منزلِ مقصود کی راہ پا سکو۔[۹] جس نے ایک خاص

دکھا دیتی ہے۔ مگر اس کے باوجود تمہارے خالق نے اسے اتنا پُر سکون بنا دیا ہے کہ تم آرام سے اس پر سوتے ہو اور تمہیں ذرا جھٹکا تک نہیں لگتا۔ تم اس پر رہتے ہو اور تمہیں یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ یہ کرۂ معلّق ہے اور تم اس پر سر کے بل لٹکے ہوئے ہو۔ تم اطمینان سے اُس پر چلتے پھرتے ہو اور تمہیں یہ خیال تک نہیں آتا کہ تم بندوق کی گولی سے بھی زیادہ تیز رفتار گاڑی پر سوار ہو۔ بے تکلف اُسے کھودتے ہو، اس کا سینہ چیرتے ہو، طرح طرح سے اُس کو پیٹ کر اپنا رزق اُس سے وصول کرتے ہو، حالانکہ اس کی ایک معمولی سی جُھرجُھری کبھی زلزلے کی شکل میں آکر تمہیں خبر دے دیتی ہے کہ یہ کس بلا کا خوفناک دیو ہے جسے اللہ نے تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم صفحات: ۵۹۰ تا ۵۹۲)

۸ پہاڑوں کے بیچ بیچ میں درے، اور پھر کوہستانی اور میدانی علاقوں میں دریا وہ قدرتی راستے ہیں جو اللہ نے زمین کی پشت پر بنا دیئے ہیں۔ انسان انہی کی مدد سے کرۂ زمین پر پھیلا ہے۔ اگر پہاڑی سلسلوں کو کسی شگاف کے بغیر بالکل ٹھوس دیوار کی شکل میں کھڑا کر دیا جاتا اور زمین میں کہیں دریا، ندیاں، نالے نہ ہوتے تو آدمی جہاں پیدا ہوا تھا اُسی علاقے میں مقید ہو کر رہ جاتا۔ پھر اللہ نے مزید فضل یہ فرمایا کہ تمام روئے زمین کو یکساں بنا کر نہیں رکھ دیا، بلکہ اس میں قسم قسم کے ایسے امتیازی نشانات (LAND MARKS) قائم کر دیئے جن کی مدد سے انسان مختلف علاقوں کو پہچانتا ہے اور ایک علاقے اور دوسرے علاقے کا فرق محسوس کرتا ہے۔ یہ دوسرا اہم ذریعہ ہے جس کی بدولت انسان کے لیے زمین میں نقل و حرکت آسان ہوئی۔ اس نعمت کی قدر آدمی کو اس وقت معلوم ہوتی ہے جب اسے کسی لق و دق صحرا میں جانے کا اتفاق ہوتا ہے، جہاں سینکڑوں میل تک زمین ہر قسم کے امتیازی نشانات سے خالی ہوتی ہے اور آدمی کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچا ہے اور آگے کدھر جاتے۔

۹ یہ فقرہ بیک وقت دو معنی دے رہا ہے۔ ایک معنی یہ کہ تم ان قدرتی راستوں اور ان نشاناتِ راہ کی مدد سے اپنا راستہ معلوم کر سکو اور اس جگہ تک پہنچ سکو جہاں جانا چاہتے ہو۔ دوسرے معنی یہ کہ اللہ جلّ شانہٗ کی اِس کاریگری کو دیکھ کر تم ہدایت حاصل کر سکو، حقیقتِ نفس الامری کو پا سکو، اور یہ سمجھ سکو

مقدار میں آسمان سے پانی اُتارا[11] اور اس کے ذریعہ سے مُردہ زمین کو جِلا اٹھایا، اِسی طرح ایک روز تم زمین سے برآمد کیے جاؤ گے[12] وہی جس نے یہ تمام جوڑے پیدا کیے[13]، اور جس نے تمہارے لیے

کہ زمین میں یہ انتظام اَلل ٹپ نہیں ہو گیا ہے، نہ بہت سے خداؤں نے مل کر یہ تدبیر کی ہے، بلکہ ایک ربّ حکیم ہے جس نے اپنی مخلوق کی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر پہاڑوں اور میدانوں میں یہ راستے بنائے ہیں اور زمین کے ایک ایک خطّے کو بے شمار طریقوں سے ایک الگ شکل دی ہے جس کی بدولت انسان ہر خطّے کو دوسرے سے ممیّز کر سکتا ہے۔

[11] یعنی ہر علاقے کے لیے بارش کی ایک اوسط مقدار مقرّر کی جو مدّتہائے دراز تک سال بہ سال ایک ہی ہموار طریقے سے چلتی رہتی ہے۔ اس میں ایسی بے قاعدگی نہیں رکھی کہ کبھی سال میں دو انچ بارش ہو اور کبھی دو سو انچ ہو جائے۔ پھر وہ اُس کو مختلف زمانوں اور مختلف اوقات میں جگہ جگہ پھیلا کر اس طرح برساتا ہے کہ بالعموم وہ وسیع پیمانے پر زمین کی بارآوری کے لیے نافع ہوتی ہے۔ اور یہ بھی اس کی حکمت ہی ہے کہ زمین کے بعض حصّوں کو اُس نے بارش سے قریب قریب بالکل محروم کر کے بے آب و گیاہ صحرا بنا دیئے ہیں، اور بعض دوسرے حصّوں میں وہ کبھی قحط ڈال دیتا ہے اور کبھی طوفانی بارش کر دیتا ہے تاکہ آدمی یہ جان سکے کہ زمین کے آباد علاقوں میں بارش اور اس کی عام باقاعدگی کتنی بڑی نعمت ہے، اور یہ بھی اُس کو یاد رہے کہ اِس نظام پر کوئی دوسری طاقت حکمران ہے جس کے فیصلوں کے آگے کسی کی کچھ پیش نہیں جاتی۔ کسی میں یہ طاقت نہیں ہے کہ ایک ملک میں بارش کے عام اوسط کو بدل سکے، یا زمین کے وسیع علاقوں پر اس کی تقسیم میں فرق ڈال سکے، یا کسی آتے ہوئے طوفان کو روک سکے، یا روٹھے ہوئے بادلوں کو منا کر اپنے ملک کی طرف کھینچ لائے اور انہیں برسنے پر مجبور کر دے (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، صفحات ۵۰۲-۵۰۳۔ جلد سوم، ص ۲۷۰-۲۷۲)۔

[12] یہاں پانی کے ذریعہ سے زمین کے اندر روئیدگی کی پیدائش کو بیک وقت دو چیزوں کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ یہ کام خدائے واحد کی قدرت و حکمت سے ہو رہے ہیں، کوئی دوسرا اس کارِ خدائی میں اس کا شریک نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ہو سکتی ہے اور ہو گی (مزید

کشتیوں اور جانوروں کو سواری بنایا تاکہ تم اُن کی پشت پر چڑھو اور جب اُن پر بیٹھو تو اپنے رب کا احسان یاد کرو اور کہو کہ "پاک ہے وہ جس نے ہمارے لیے اِن چیزوں کو مسخر کر دیا ورنہ ہم اِنہیں قابو میں لانے کی طاقت نہ رکھتے تھے۔[۱۳] اور ایک روز ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے[۱۴]"۔

تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد دوم، ص ۵۴۹-۵۵۰۔ جلد سوم، ص ۲۰۲-۲۰۵-۵۸۹-۵۹۰-۷۴۲-۷۴۳-۷۴۸-۷۴۹۔ جلد چہارم، سورۂ فاطر، حاشیہ ۱۶، سورۂ یٰس، حاشیہ ۲۹۔

۱۲ جوڑوں سے مراد صرف نوعِ انسانی کے زن و مرد، اور حیوانات و نباتات کے نر و مادہ ہی نہیں ہیں، بلکہ دوسری بے شمار چیزیں بھی ہیں جن کو خالق نے ایک دوسرے کا جوڑ بنایا ہے اور جن کے اختلاط یا امتزاج سے دنیا میں نئی نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں۔ مثلاً عناصر میں بعض کا بعض سے جوڑ لگتا ہے اور بعض کا بعض سے نہیں لگتا۔ جن کا جوڑ ایک دوسرے سے لگتا ہے انہی کے ملنے سے طرح طرح کی ترکیبیں واقع ہو رہی ہیں۔ یا مثلاً بجلی میں منفی اور مثبت بجلیاں ایک دوسرے کا جوڑ ہیں اور ان کی باہمی کشش ہی دنیا میں عجیب عجیب کرشموں کی موجب بن رہی ہے۔ یہ اور دوسرے ان گنت جوڑے جو قسم قسم کی مخلوقات کے اندر اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے ہیں، ان کی ساخت، اور ان کی باہمی مناسبتوں، اور ان کے تعامل کی گوناگوں شکلوں، اور ان کے ملنے سے پیدا ہونے والے نتائج پر اگر انسان غور کرے تو اس کا دل یہ گواہی دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ سارا کارخانۂ عالم کسی ایک ہی زبردست صانع حکیم کا بنایا ہوا ہے اور اُسی ایک کی تدبیر سے چل رہا ہے۔ صرف ایک عقل کا اندھا ہی یہ فرض کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی حکیم کے بغیر ہوا اور ہو رہا ہے، یا اس میں ایک سے زیادہ خداؤں کی دخیل کاری کا کوئی امکان ہے۔

۱۳ یعنی زمین کی تمام مخلوقات میں سے تنہا انسان کو کشتیاں اور جہاز چلانے اور سواری کے لیے جانور استعمال کرنے کی یہ مقدرت اللہ تعالیٰ نے اس لیے تو نہیں دی تھی کہ وہ غلے کی بوریوں کی طرح ان پر لد جائے اور کبھی نہ سوچے کہ آخر وہ کون ہے جس نے ہمارے لیے بحرِ زخار میں کشتیاں دوڑانے کے امکانات پیدا کیے اور جس نے جانوروں کی بے شمار اقسام میں سے بعض کو اس طرح پیدا کیا کہ وہ ہم سے بدرجہا زیادہ طاقتور ہونے کے باوجود ہمارے تابع فرمان بن جاتے ہیں اور ہم ان پر سوار ہو کر جدھر چاہتے ہیں انہیں لیے پھرتے ہیں۔ ان نعمتوں سے

فائدہ اٹھانا اور نعمت دینے والے کو فراموش کر دینا، دل کے مُردہ اور عقل و ضمیر کے بے حس ہونے کی علامت ہے۔ ایک زندہ اور حساس قلب و ضمیر رکھنے والا انسان تو ان سواریوں پر جب بیٹھے گا تو اس کا دل احساسِ نعمت اور شکرِ نعمت کے جذبے سے لبریز ہو جائے گا۔ وہ پکار اُٹھے گا کہ پاک ہے وہ ذات جس نے میرے لیے اِن چیزوں کو مسخر کیا۔ پاک ہے اِس سے کہ اُس کی ذات و صفات اور اختیارات میں کوئی اس کا شریک ہو۔ پاک ہے اِس کمزوری سے کہ اپنی خدائی کا کام خود چلانے سے وہ عاجز ہو اور دوسرے مددگار خداؤں کی اسے حاجت پیش آئے۔ پاک ہے اس سے کہ میں اِن نعمتوں کا شکریہ ادا کرنے میں اس کے ساتھ کسی اور کو شریک کروں۔

اس آیت کے منشا کی بہترین عملی تفسیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اذکار ہیں جو سواریوں پر بیٹھتے وقت آپ کی زبانِ مبارک پر جاری ہوتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور جب سفر پر جانے کے لیے سواری پر بیٹھتے تو تین مرتبہ اللہ اکبر کہتے، پھر یہ آیت پڑھتے، اور اس کے بعد یہ دعا مانگا کرتے تھے: اللھم انی اسألک فی سفری ھذا البرّ والتقویٰ، ومن العمل ما ترضیٰ، اللھم ھوّن لنا السفر واطوِ لنا البعید، اللھم انت الصاحب فی السفر، والخلیفۃ فی الاھل، اللھم اصحبنا فی سفرنا واخلفنا فی اھلنا (مسند احمد، مسلم، ابوداؤد، نسائی، دارمی، ترمذی)۔ "خدایا میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ میرے اس سفر میں مجھے نیکی اور تقویٰ اور ایسے عمل کی توفیق دے جو تجھے پسند ہو۔ خدایا ہمارے لیے سفر کو آسان کر دے اور لمبی مسافت کو لپیٹ دے، خدایا تو ہی سفر کا ساتھی اور ہمارے پیچھے ہمارے اہل و عیال کا نگہبان ہے، خدایا ہمارے سفر میں ہمارے ساتھ رہ اور پیچھے ہمارے گھر والوں کی خبر گیری فرما۔"

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بسم اللہ کہہ کر رکاب میں پاؤں رکھا، پھر سوار ہونے کے بعد فرمایا الحمد للہ، سبحان الذی سخّر لنا ھذا ...، پھر تین دفعہ الحمد للہ اور تین مرتبہ اللہ اکبر کہا، پھر فرمایا سبحانک، لا الٰہ الا انت، قد ظلمتُ نفسی فاغفر لی۔ اس کے بعد آپ ہنس دیے۔ میں نے پوچھا یا رسول اللہ آپ ہنسے کس بات پر؟ فرمایا، بندہ جب ربِّ اغفر لی

(یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہوئے بھی) اِن لوگوں نے اُس کے بندوں میں سے

کہتا ہے تو اللہ تبارک و تعالیٰ کو اس کی یہ بات بڑی پسند آتی ہے، وہ فرماتا ہے کہ میرا یہ بندہ جانتا ہے کہ میرے سوا مغفرت کرنے والا کوئی اور نہیں ہے (احمد، ابوداؤد، ترمذی، نسائی وغیرہ)۔

ایک صاحب ابومجلز بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں جانور پر سوار ہوا اور میں نے آیت سُبْحَانَ الَّذِیْ سَخَّرَلَنَا ھٰذَا پڑھی۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا اس طرح کرنے کا تمہیں حکم دیا گیا ہے؟ میں نے عرض کیا پھر کیا کہوں؟ فرمایا یوں کہو کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمیں اسلام کی ہدایت دی، شکر ہے اس کا کہ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر ہم پر احسان فرمایا، شکر ہے اس کا کہ اس نے ہمیں اُس بہترین اُمت میں داخل کیا جو خلق خدا کے لیے نکالی گئی ہے، اس کے بعد یہ آیت پڑھو (ابن جریر۔ احکام القرآن للجصاص)۔

۱۳؎ مطلب یہ ہے کہ ہر سفر پر جاتے ہوئے یاد کرلو کہ آگے ایک بڑا اور آخری سفر بھی درپیش ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ ہر سواری کو استعمال کرنے میں یہ امکان بھی ہوتا ہے کہ شاید کوئی حادثہ اسی سفر کو آدمی کا آخری سفر بنا دے، اس لیے بہتر ہے کہ ہر مرتبہ وہ اپنے رب کی طرف واپسی کو یاد کر کے چلے تاکہ اگر مرنا ہی ہے تو بے خبر نہ مرے۔

یہاں تھوڑی دیر ٹھیر کر ذرا اِس تعلیم کے اخلاقی نتائج کا بھی اندازہ کیجیے۔ کیا آپ یہ تصوّر کر سکتے ہیں کہ جو شخص کسی سواری پر بیٹھتے وقت سمجھ بوجھ کر پُورے شعور کے ساتھ اس طرح اللہ کو اور اس کے حضور اپنی واپسی اور جوابدہی کو یاد کر کے چلا ہو وہ آگے جا کر کسی فسق و فجور یا کسی ظلم و ستم کا مرتکب ہوگا؟ کیا کسی فاحشہ سے ملاقات کے لیے، یا کسی کلب میں شراب خوری اور قماربازی کے لیے جاتے وقت بھی کوئی شخص یہ کلمات زبان سے نکال سکتا ہے یا ان کا خیال کر سکتا ہے؟ کیا کوئی حاکم یا سرکاری افسر، یا تاجر، جو یہ کچھ سوچ کر اور اپنے مُنہ سے کہہ کر گھر سے چلا ہو، اپنی جائے عمل پر پہنچ کر لوگوں کے حق مار سکتا ہے؟ کیا کوئی سپاہی بے گناہوں کا خون بہانے اور کمزوروں کی آزادی پر ڈاکہ مارنے کے لیے جاتے وقت بھی اپنے ہوائی جہاز یا ٹینک پر قدم رکھتے ہوئے یہ الفاظ زبان پر لا سکتا ہے؟ اگر

ع بعض کو اس کا جُز بنا ڈالا،[۱۵] حقیقت یہ ہے کہ انسان کھُلا احسان فراموش ہے ع

نہیں، تو یہی ایک چیز ہر اس نقل و حرکت پر بند باندھ دینے کے لیے کافی ہے جو معصیت کے لیے ہو

[۱۵] جُزء بنا دینے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے کسی بندے کو اُس کی اولاد قرار دے دیا جائے، کیونکہ اولاد لامحالہ باپ کی ہم جنس اور اس کے وجود کا ایک جُزء ہوتی ہے، اور کسی شخص کو اللہ کا بیٹا یا بیٹی کہنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ اُسے اللہ کی ذات میں شریک کیا جا رہا ہے۔ اِس کے علاوہ کسی مخلوق کو اللہ کا جُزء بنانے کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ اُسے اُن صفات اور اختیارات کا حامل قرار دیا جائے جو اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں، اور اِسی تصور کے تحت اُس سے دُعائیں مانگی جائیں، یا اُس کے آگے عبودیت کے مراسم ادا کیے جائیں، یا اس کی تحریم و تحلیل کو شریعت واجب الاتباع ٹھیرا لیا جائے۔ کیونکہ اس صورت میں آدمی الوہیت و ربوبیت کو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان بانٹتا ہے اور اس کا ایک جُزء بندوں کے حوالے کر دیتا ہے۔

ضروری اعلان

(۱) منصب رسالت نمبر کی چند کاپیاں دفتر "ترجمان القرآن" میں بچی ہوئی ہیں۔ قیمت فی کاپی ۵۰-۳ روپے ہے۔ مگر اب فی کاپی ۲ روپے (مع ڈاک خرچ) کے حساب سے جو اصحاب چاہیں خرید سکتے ہیں۔

(۲) "ترجمان القرآن" کے پُرانے پرچے از جون ۴۳ء تا اکتوبر ۶۳ء دفتر میں غیر مسلسل موجود ہیں۔ ۳ آنے فی کاپی کے حساب سے جن اصحاب کو ضرورت ہو منگوا سکتے ہیں۔

مینجر ترجمان القرآن

اچھرہ۔ لاہور

اسلام کے اصولِ حکمرانی

ابو الاعلیٰ مودودی

ظہورِ اسلام کے ساتھ جو مسلم معاشرہ وجود میں آیا، اور پھر ہجرت کے بعد سیاسی طاقت حاصل کر کے جس ریاست کی شکل اس نے اختیار کی، اُس کی بنیاد چند واضح اصولوں پر تھی۔ ان میں سے اہم تر جن کا تعلق ہماری اِس بحث سے ہے، یہ ہیں۔

۱۔ قانونِ خداوندی کی بالاتری: اس ریاست کا اوّلین بنیادی قاعدہ یہ تھا کہ حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اور اہلِ ایمان کی حکومت دراصل "خلافت" ہے جسے مطلق العنانی کے ساتھ کام کرنے کا حق نہیں ہے، بلکہ اُس کو لازماً اُس قانونِ خداوندی کے تحت رہ کر ہی کام کرنا چاہیے جس کا ماخذ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنّت ہے۔ قرآن مجید میں اس قاعدے کو حسبِ ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے: النساء، ۵۹-۶۴-۶۵-۸۰-۱۰۵-المائدہ، ۴۴-۴۵-۴۷-الاعراف، ۳-یوسف، ۴۰-النور، ۵۴-۵۵-الاحزاب، ۳۶-الحشر، ۷[1]۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے متعدد ارشادات میں اس اصل الاصول کو پوری صراحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے:

علیکم بکتاب اللہ، احلوا حلالہ وحرموا حرامہ[2]	تم پر لازم ہے کتاب اللہ کی پیروی جس چیز کو اس نے حلال کیا ہے اسے حلال کرو، اور جسے اس نے حرام کیا ہے اسے حرام کرو
ان اللہ فرض فرائض فلا تضیعوھا وحرم حرمات فلا تنتھکوھا وحد	اللہ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں، انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ حرمتیں مقرر کی ہیں، انہیں نہ توڑو۔ کچھ

[1] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو ترجمان القرآن، نومبر، دسمبر ۱۹۶۴ء "قرآن کی سیاسی تعلیمات"

حدودًا فلا تعتدوھا وسکت عن اشیاء من غیر نسیانٍ فلا تبحثوا عنھا[۲]

حدود مقرر کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور کچھ چیزوں کے بارے میں سکوت فرمایا ہے بغیر اس کے کہ اسے نسیان لاحق ہُوا ہو، اُن کی کھوج میں نہ پڑو۔

من اقتدی بکتاب اللہ لا یضلّ فی الدنیا ولا یشقی فی الاٰخرۃ[۳]

جس نے کتاب اللہ کی پیروی کی وہ نہ دنیا میں گمراہ ہوگا نہ آخرت میں بدبخت۔

ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما، کتاب اللہ وسنّۃ رسولہٖ[۴]

مَیں نے تمہارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں جنہیں اگر تم تھامے رہو تو کبھی گمراہ نہ ہوگے، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سُنّت۔

ما امرتکم بہٖ فخذوہ وما نھیتکم عنہ فانتھوا[۵]

جس چیز کا مَیں نے تم کو حکم دیا ہے اسے اختیار کرلو اور جس چیز سے روکا ہے اس سے رُک جاؤ۔

۲۔ عدل بین الناس دوسرا قاعدہ جس پر اس ریاست کی بنا رکھی گئی تھی، یہ تھا کہ قرآن وسُنّت کا دیا ہُوا قانون سب کے لیے یکساں ہے اور اس کو مملکت کے ادنیٰ ترین آدمی سے لے کر مملکت کے سربراہ تک سب پر یکساں نافذ ہونا چاہیے۔ کسی کے لیے بھی اس میں امتیازی سلوک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ اپنے نبی، صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ اعلان کرنے کی ہدایت فرماتا ہے کہ

وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ[۷]

اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کروں۔

۲؎ کنزالعمال بحوالہ طبرانی و مُسند احمد، جلد اول، حدیث نمبر ۹۰۷-۹۶۶ (طبع دائرۃ المعارف، حیدرآباد ۱۹۵۵ء)

۳؎ مشکوٰۃ بحوالہ دارقطنی، باب الاعتصام بالکتاب والسنّۃ۔ کنزالعمال، ج ۱، ح ۹۰۱-۹۰۲

۴؎ مشکوٰۃ بحوالہ رزین، باب مذکور

۵؎ مشکوٰۃ بحوالہ مؤطا، باب مذکور۔ کنزالعمال، ج ۱، ح ۸۷۷-۹۴۹-۹۵۵-۱۰۰۱

۶؎ کنزالعمال، ج ۱، ح ۸۸۶ — ۷؎ الشوریٰ، ۱۵

یعنی میں بے لاگ انصاف پسندی اختیار کرنے پر مامور ہوں۔ میرا یہ کام نہیں ہے کہ کسی کے حق میں اور کسی کے خلاف تعصب برتوں۔ میرا سب انسانوں سے یکساں تعلق ہے، اور وہ ہے عدل و انصاف کا تعلق۔ حق جس کے ساتھ ہو میں اس کا ساتھی ہوں اور حق جس کے خلاف ہو میں اس کا مخالف ہوں۔ میرے دین میں کسی کے لیے بھی کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اپنے اور غیر، بڑے اور چھوٹے، شریف اور کمین کے لیے الگ الگ حقوق نہیں ہیں۔ جو کچھ حق ہے وہ سب کے لیے حق ہے۔ جو گناہ ہے وہ سب کے لیے گناہ ہے۔ جو حرام ہے وہ سب کے لیے حرام ہے۔ جو حلال ہے وہ سب کے لیے حلال ہے۔ اور جو فرض ہے وہ سب کے لیے فرض ہے۔ میری اپنی ذات بھی قانونِ خداوندی کی اس ہمہ گیری سے مستثنیٰ نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود اس قاعدے کو یوں بیان فرماتے ہیں:

انما ھلک من کان قبلکم انھم کانوا یقیمون الحد علی الوضیع ویترکون الشریف، والذی نفس محمد بیدہ لو ان فاطمۃ (بنت محمد) فعلت ذالک لقطعت یدھا۔[8]

تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں وہ اسی لیے تو تباہ ہوئیں کہ وہ لوگ کم تر درجے کے مجرموں کو قانون کے مطابق سزا دیتے تھے اور اونچے درجے والوں کو چھوڑ دیتے تھے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اگر محمد کی اپنی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں ضرور اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

حضرت عمرؓ بیان کرتے ہیں:۔

رأیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یُقِیدُ من نفسہٖ۔[9]

میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی ذات سے بدلہ دیتے دیکھا ہے۔

---

[8] بخاری، کتاب الحدود، ابواب نمبر ۱۱-۱۲

[9] کتاب الخراج، امام ابو یوسف ص ۱۱۶، المطبعۃ السلفیہ، مصر، طبع ثانی ۱۳۵۲ھ۔ مسند ابو داؤد الطیالسی، حدیث نمبر ۵۵، طبع دائرۃ المعارف، حیدر آباد، ۱۳۲۱ھ۔

۳۔ مساوات بین المسلمین: اسی قاعدے کی فرع یہ تیسرا قاعدہ ہے جو اس ریاست کے مسلمات میں سے تھا کہ تمام مسلمانوں کے حقوق بلا لحاظ رنگ و نسل و زبان و وطن بالکل برابر ہیں۔ کسی فرد، گروہ، طبقے یا نسل و قوم کو اس ریاست کے حدود میں نہ امتیازی حقوق حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کی حیثیت کسی دوسرے کے مقابلے میں فروتر قرار پا سکتی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ (الحجرات: آیت ۱۰)	مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔
يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (الحجرات: ۱۳)	لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب ذیل ارشادات اس قاعدے کی صراحت کرتے ہیں:

إِنَّ اللَّهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَلٰكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ[۵۰]	اللہ تمہاری صورتیں اور تمہارے مال نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دل اور تمہارے اعمال دیکھتا ہے
اَلْمُسْلِمُونَ إِخْوَةٌ، لَا فَضْلَ لِأَحَدٍ عَلَى أَحَدٍ إِلَّا بِالتَّقْوَىٰ[۵۱]	مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ کسی کو کسی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔
يَا أَيُّهَا النَّاسُ، أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ، وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَسْوَدَ عَلَى أَحْمَرَ، وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى	لوگو، سن لو، تمہارا رب ایک ہے۔ عربی کو عجمی پر یا عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں، نہ کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی فضیلت

۵۰۔ تفسیر ابن کثیر، بحوالہ مسلم و ابن ماجہ، ج ۴، ص ۲۱۷، مطبعۃ مصطفیٰ محمد، مصر، ۱۹۳۷

۵۱۔ ابن کثیر، بحوالہ طبرانی، ج ۴، ص ۲۱۷

اسود الا بالتقوٰی[۱۱]	ہے، مگر تقویٰ کے لحاظ سے۔
من شھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ و استقبل قبلتنا وصلّی صلوٰتنا و اکل ذبیحتنا فھو المسلم لہ ما للمسلم وعلیہ ما علی المسلم[۱۲]۔	جس نے شہادت دی کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں، اور ہمارے قبلے کی طرف رُخ کیا اور ہماری طرح نماز پڑھی اور ہمارا ذبیحہ کھایا وہ مسلمان ہے۔ اس کے حقوق وہی ہیں جو مسلمان کے حقوق ہیں اور اس پر فرائض وہی ہیں جو مسلمان کے فرائض ہیں۔
المؤمنون تتکافأ دماؤھم، وھم ید علی من سواھم، ویسعیٰ بذمتھم ادناھم[۱۳]	مومنوں کے خون ایک دوسرے کے برابر ہیں، وہ دوسروں کے مقابلے میں ایک ہیں، اور ان کا ایک ادنیٰ آدمی بھی ان کی طرف سے ذمہ لے سکتا ہے۔
لیس علی المسلم جزیۃ[۱۴]	مسلمان پر جزیہ عائد نہیں کیا جاسکتا۔

۴۔ حکومت کی ذمہ داری | چوتھا اہم قاعدہ جس پر یہ ریاست قائم ہوئی تھی، یہ تھا کہ حکومت اور اس کے اختیارات اور اموال، خدا اور مسلمانوں کی امانت ہیں جنہیں خداترس، ایماندار اور عادل لوگوں کے سپرد کیا جانا چاہیے اور اس امانت میں کسی شخص کو من مانے طریقے پر، یا نفسانی اغراض کے لیے تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا، وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ	اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہلِ امانت کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو

[۱۱] تفسیر روح المعانی، بحوالہ بیہقی و ابن مردویہ، ج ۲۶، ص ۱۴۸۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر

[۱۲] بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب ۲۸

[۱۳] ابوداؤد، کتاب الدیات، باب ۱۱۔ نسائی، کتاب القسامہ، باب ۱۰، ۱۴۔

[۱۴] ابوداؤد، کتاب الامارہ باب ۳۴۔

اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ، اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ، اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا۔[۱۶]	تو عدل کے ساتھ کرو۔ اللہ تمہیں اچھی نصیحت کرتا ہے۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے اور دیکھنے والا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الا کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہٖ فالامام الاعظم الذی علی الناس راعٍ وھو مسئول عن رعیتہٖ۔[۱۷]	خبردار رہو، تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیّت کے بارے میں جوابدہ ہے اور مسلمانوں کا سب سے بڑا سردار جو سب پر حکمران ہو، وہ بھی راعی ہے اور اپنی رعیّت کے بارے میں جوابدہ۔
ما من والٍ یلی رعیۃ من المسلمین فیموت وھو غاشٌ لھم الا حرم اللّٰہ علیہ الجنۃ۔[۱۸]	کوئی حکمراں، جو مسلمانوں میں سے کسی رعیّت کے معاملات کا سربراہ ہو، اگر اس حالت میں مرے کہ وہ ان کے ساتھ دھوکا اور خیانت کرنے والا تھا، تو اللہ اس پر جنت حرام کر دے گا۔
ما من امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجھد لھم ولا ینصح الا لم یدخل معھم فی الجنۃ۔[۱۹]	کوئی حاکم جو مسلمانوں کی حکومت کا کوئی منصب سنبھالے پھر اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے جان نہ لڑائے اور خلوص کے ساتھ کام نہ کرے وہ مسلمانوں کے ساتھ جنت میں قطعاً نہ داخل ہوگا۔

---

[۱۶] النساء، ۵۸ [۱۷] بخاری، کتاب الاحکام، باب ۱۔ مسلم، کتاب الامارہ، باب ۵

[۱۸] بخاری، کتاب الاحکام، باب ۸۔ مسلم، کتاب الایمان، باب ۶۱۔ کتاب الامارہ، باب ۵

[۱۹] مسلم، کتاب الامارہ، باب ۵

یا اباذر انك ضعیف وانها امانة وانها یوم القیامة خزی و ندامة الا من اخذ بحقها وادی الذی علیه فیها[۱۲۰]

(نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا) اے ابوذر، تم کمزور آدمی ہو اور حکومت کا منصب ایک امانت ہے، اور قیامت کے روز وہ رسوائی اور ندامت کا موجب ہوگا سوائے اُس شخص کے جو اس کے حق کا پُورا پُورا لحاظ کرے اور جو ذمہ داری اس پر عائد ہوتی ہے اسے ٹھیک ٹھیک ادا کرے۔

من اخون الخیانة تجارة الوالی فی رعیته[۱۲۱]

کسی حاکم کا اپنی رعیت میں تجارت کرنا بدترین خیانت ہے۔

من ولی لنا عملا ولم تکن له زوجة فلیتخذ زوجة، ومن لم یکن له خادم فلیتخذ خادمًا. اولیس له مسکن فلیتخذ مسکنًا. اولیس له دابة فلیتخذ دابة. فمن اصاب سوی ذالك فھو غال اوسارق[۱۲۲]

جو شخص ہماری حکومت کے کسی منصب پر ہو وہ اگر بیوی نہ رکھتا ہو تو شادی کرلے۔ اگر خادم نہ رکھتا ہو تو ایک خادم حاصل کرلے۔ اگر گھر نہ رکھتا ہو تو ایک گھر لے لے۔ اگر سواری نہ رکھتا ہو تو ایک سواری لے لے۔ اس سے آگے جو شخص قدم بڑھاتا ہے وہ خائن ہے یا چور۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ فرماتے ہیں:

من یکن امیرًا فانه من اطول الناس حسابا واغلظه عذابا، ومن لا یکون امیرًا فانه من ایسر الناس

جو شخص حکمراں ہو اس کو سب سے زیادہ بھاری حساب دینا ہوگا اور وہ سب سے زیادہ سخت عذاب کے خطرے میں مبتلا ہوگا، اور جو حکمران نہ ہو اس کو

---

۱۲۰ کنز العمال، ج ۶، ح ۹۸ - ۱۲۲

۱۲۱ کنز العمال، ج ۶، ح ۸،

۱۲۲ کنز العمال، ج ۶، ح ۳۴۶

حسابًا واھون نه عذابًا لان الامراء اقرب الناس من ظلم المومنین ومن یظلم المومنین فانما یخفر اللہ[۲۳]

ہلکا حساب دینا ہوگا اور اس کے سبب ہلکے عذاب کا خطرہ ہے، کیونکہ حکام کے لیے سب سے بڑھ کر اس بات کے مواقع ہیں کہ ان کے ہاتھوں مسلمانوں پر ظلم ہو، اور جو مسلمانوں پر ظلم کرے وہ خدا سے غداری کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں:

لو ھلک حمل من ولد الضان ضیاعًا بشاطئ الفرات خشیت ان یسألنی اللہ[۲۴]

دریائے فرات کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی اگر ضائع ہو جائے تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ اللہ مجھ سے باز پُرس کرے گا۔

۵۔ شوریٰ | اس ریاست کا پانچواں اہم قاعدہ یہ تھا کہ سربراہِ ریاست مسلمانوں کے مشورے اور ان کی رضامندی سے مقرر ہونا چاہیے، اور اسے حکومت کا نظام بھی مشورے سے چلانا چاہیے۔ قرآنِ مجید میں ارشاد ہوا ہے:۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ[۲۵]

اور مسلمانوں کے معاملات باہمی مشورے سے چلتے ہیں۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹)

اور اے نبی اُن سے معاملات میں مشاورت کرو۔

حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر آپ کے بعد ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کے متعلق نہ قرآن میں کوئی حکم ہو اور نہ آپ سے ہم نے کچھ سنا ہو تو ہم کیا کریں؟ فرمایا:

---

۲۳ کنز العمال، ج ۵، ح ۲۵۰۵

۲۴ کنز العمال، ج ۵، ح ۲۵۱۲

۲۵ الشوریٰ، ۳۸

اجمعوا العابدین من امتی و اجعلوہ بینکم شوریٰ ولا تقضوا برأی واحد[۲۶]	میری امت کے عابد لوگوں کو جمع کرو اور اس معاملے کو آپس کے مشورے کے لیے پیش کر دو۔ کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کر ڈالو۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں:

من دعا الی امارۃ نفسہ او غیرہ من غیر مشورۃ من المسلمین فلا یحل لکم ان لا تقتلوہ[۲۷]	جو شخص مسلمانوں کے مشورے کے بغیر اپنی یا کسی اور شخص کی امارت کے لیے دعوت دے تو تمہارے لیے حلال نہیں ہے کہ اسے قتل نہ کرو۔

ایک اور روایت میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل ہوا ہے:

لا خلافۃ الا عن مشورۃ[۲۸]	مشورے کے بغیر کوئی خلافت نہیں۔

۶۔ اطاعت فی المعروف: چھٹا قاعدہ جس پر یہ ریاست قائم کی گئی تھی، یہ تھا کہ حکومت کی اطاعت صرف معروف میں واجب ہے، معصیت میں کسی کو اطاعت کا حق نہیں پہنچتا۔ دوسرے الفاظ میں اس قاعدے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اور حکام کا صرف وہی حکم ان کے ماتحتوں اور رعیت کے لیے واجب الاطاعت ہے جو قانون کے مطابق ہو۔ قانون کے خلاف حکم دینے کا نہ انہیں حق پہنچتا ہے اور نہ کسی کو اس کی اطاعت کرنی چاہیے۔ قرآن مجید میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کو بھی اطاعت فی المعروف کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے، حالانکہ آپ کی طرف سے کسی معصیت کا حکم صادر ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا:

وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ[۲۹]	اور یہ کہ وہ کسی امر معروف میں آپ کی نافرمانی

۲۶۔ تفسیر روح المعانی، ج ۲۵، ص ۴۲

۲۷۔ کنز العمال، ج ۵، ح ۲۵۷۷

۲۸۔ کنز العمال، ج ۵، حدیث ۲۳۵۴

۲۹۔ الممتحنہ ۱۲:

نہ کریں گی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

السمع والطاعة على المرء المسلم فيما احب اوكره مالم يؤمر بمعصية فاذا امر بمعصية فلا سمع ولا طاعة[۳۰]

ایک مسلمان پر اپنے امیر کی سمع وطاعت فرض ہے خواہ اس کا حکم اسے پسند ہو یا ناپسند تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر کوئی سمع وطاعت نہیں۔

لا طاعة في معصية الله، انما الطاعة في المعروف[۳۱]

اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے اطاعت صرف معروف میں ہے۔

یہ مضمون نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بکثرت ارشادات میں مختلف طریقوں سے نقل ہوا ہے۔ کہیں آپ نے فرمایا لا طاعة لمن عصى الله (جو اللہ کی نافرمانی کرے، اس کے لیے کوئی اطاعت نہیں)، کہیں فرمایا لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق (خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں)، کہیں فرمایا لا طاعة لمن لم يطع الله (جو اللہ کی اطاعت نہ کرے اس کے لیے کوئی اطاعت نہیں)، کہیں فرمایا من امركم من الولاة بمعصية فلا تطيعوه (حکام میں سے جو کوئی تمہیں کسی معصیت کا حکم دے اس کی اطاعت نہ کرو)[۳۲]

حضرت ابوبکرؓ اپنے ایک خطبے میں فرماتے ہیں:

من ولي امر امة محمد صلى الله عليه وسلم شيئاً فلم يقم فيهم بكتاب الله

جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے معاملات میں سے کسی معاملے کا ذمہ دار بنایا گیا اور پھر اس نے

---

۳۰ بخاری، کتاب الاحکام، باب ۴۔ مسلم، کتاب الامارۃ، باب ۸۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب ۹۵۔ نسائی، کتاب البیعہ، باب ۳۳۔ ابن ماجہ، ابواب الجہاد، باب ۴۰۔

۳۱ مسلم، کتاب الامارہ، باب ۸۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب ۹۵۔ نسائی، کتاب البیعۃ، باب ۳۳۔

۳۲ کنز العمال، ج ۶، احادیث نمبر ۲۹۳-۲۹۴-۲۹۵-۲۹۶-۲۹۹-۳۰۱۔

فعلیه بهلة الله [۳۳]

لوگوں کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق کام نہ کیا اس پر اللہ کی لعنت ۔

اسی بنا پر خلیفہ ہونے کے بعد انہوں نے اپنی پہلی ہی تقریر میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ

اطیعونی ما اطعت اللہ و رسوله فاذا عصیت اللہ و رسوله فلا طاعة لی علیکم [۳۴]

میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں، اور جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

حق علی الامام ان یحکم بما انزل اللہ وان یؤدی الامانة، فاذا فعل ذالك فحق علی الناس ان یسمعوا له وان یطیعوا وان یجیبوا اذا دعوا [۳۵]

مسلمانوں کے فرمانروا پر یہ فرض ہے کہ وہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرے اور امانت ادا کرے پھر جب وہ اس طرح کام کر رہا ہو تو لوگوں پر یہ فرض ہے کہ اس کی سنیں اور مانیں اور جب انہیں پکارا جائے تو لبیک کہیں

اپنی خلافت کے زمانے میں انہوں نے اپنے ایک خطبے میں یہ اعلان فرمایا :

ما امرتکم به من طاعة اللہ فحق علیکم طاعتی فیما احببتم وما کرهتم، وما امرتکم به من معصیة

میں اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے تم کو جو حکم دوں اس کی اطاعت تم پر فرض ہے خواہ وہ حکم تمہیں پسند ہو یا ناپسند۔ اور جو حکم میں تمہیں اللہ

---

۳۳ کنز العمال، ج ۵، ح ۲۵۰۵ ۔

۳۴ کنز العمال، ج ۵، حدیث ۲۲۸۲ ۔ ایک دوسری روایت میں حضرت ابوبکر کے الفاظ یہ ہیں وان عصیت اللہ فاعصونی (اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تم میری نافرمانی کرو)، کنز العمال، ج ۵، ح ۲۲۳

۳۵ کنز العمال، ج ۵، ح ۲۵۳۱

الله فلا طاعة لاحد فی المعصیة . الطاعة فی المعروف ، الطاعة فی المعروف الطاعة فی المعروف[۳۶]	کی نافرمانی کرتے ہوتے وہاں تو معصیت میں کسی کے لیے اطاعت نہیں ۔ اطاعت صرف معروف میں ہے ۔ اطاعت صرف معروف میں ہے ۔ اطاعت صرف معروف میں ہے

۷۔ اقتدار کی طلب و حرص کا ممنوع ہونا یہ قاعدہ بھی اس ریاست کے قواعد میں سے تھا کہ حکومت کے ذمہ دارانہ مناصب کے لیے عموماً اور خلافت کے لیے خصوصاً وہ لوگ سب سے زیادہ غیر موزوں ہیں جو خود عہدہ حاصل کرنے کے طالب ہوں اور اس کے لیے کوشش کریں ۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا (القصص ۸۳)	وہ آخرت کا گھر ہم ان لوگوں کو دیں گے جو زمین میں نہ اپنی بڑائی کے طالب ہوتے ہیں اور نہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

انا واللہ لا نولی علی عملنا ھذا احداً سأله او حرص علیه[۳۷]	بخدا ہم اپنی اس حکومت کا منصب کسی ایسے شخص کو نہیں دیتے جو اس کا طالب ہو یا اس کا حریص ہو ۔
ان اخونکم عندنا من طلبه[۳۸]	تم میں سب سے بڑھ کر خائن ہمارے نزدیک وہ ہے جو اسے خود طلب کرے
ان لا نستعمل علی عملنا من	ہم اپنی حکومت میں کسی ایسے شخص کو عامل

۳۶؎ کنز العمال ، ج ۵ ، ح ۲۵۸۷

۳۷؎ بخاری کتاب الاحکام ، باب ۷ ، مسلم ، کتاب الامارہ ، باب ۳

۳۸؎ ابوداؤد ، کتاب الامارہ ، باب ۲

ارادۂ[۳۸] نہیں بنانے جو اس کی خواہش کرے۔

یا عبد الرحمٰن بن سمرۃ لا تسأل الامارۃ فانک اذا اوتیتہا عن مسئلۃ وکلت الیہا، وان اوتیتہا عن غیر مسئلۃ اعنت علیہا[۳۹]

(عبد الرحمٰن بن سمرہ سے حضورؐ نے فرمایا) اے عبد الرحمٰن بن سمرہ امارت کی درخواست نہ کرو، کیونکہ اگر وہ تمہیں مانگنے پر دی گئی تو خدا کی طرف سے تم کو اسی کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ اور اگر وہ تمہیں بے مانگے ملی تو خدا کی طرف سے تم کو اس کا حق ادا کرنے میں مدد دی جائے گی۔

۸۔ ریاست کا مقصد وجود: اس ریاست میں حکمراں اور اس کی حکومت کا اوّلین فریضہ یہ قرار دیا گیا تھا کہ وہ اسلامی نظامِ زندگی کو کسی ردّ و بدل کے بغیر جُوں کا تُوں قائم کرے، اور اسلام کے معیارِ اخلاق کے مطابق بھلائیوں کو فروغ دے اور بُرائیوں کو مٹائے۔ قرآن مجید میں اس ریاست کا مقصد وجود یہ بیان کیا گیا ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ[۴۱]

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کرینگے اور زکوٰۃ دیں گے اور نیکی کا حکم دینگے اور بدی سے روکیں گے۔

---

[۳۹] کنز العمال، ج ۶، ح ۲۰۶

[۴۰] کنز العمال، ج ۶، ح ۶۹۔ اس مقام پر کسی کو یہ شُبہ نہ ہو کہ اگر یہ اسلام کا اصول ہے تو پھر حضرت یوسف نے مصر کے بادشاہ سے حکومت کا منصب کیوں مانگا تھا۔ دراصل حضرت یوسف کسی مسلمان ملک اور اسلامی حکومت میں نہیں بلکہ ایک کافر ملک اور کافر حکومت میں تھے۔ وہاں ایک خاص نفسیاتی موقع پر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اس وقت اگر میں بادشاہ سے حکومت کا بلند ترین منصب طلب کروں تو وہ مجھے مل سکتا ہے اور اس کے ذریعہ سے میں اِس ملک میں خدا کا دین پھیلانے کے لیے راستہ نکال سکتا ہوں، لیکن اگر میں طلبِ اقتدار سے باز رہوں تو اس کافر قوم کی ہدایت کے لیے جو نادر موقع مجھے مل رہا ہے وہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ یہ ایک خاص صورتِ حال تھی جس پر اسلام کا عام قاعدہ چسپاں نہیں ہوتا۔

[۴۱] الحج ۴۱۰

اور یہی قرآن کی رُو سے امتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود بھی ہے :

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ۔ ۱۴۳)

اور اس طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی امت (یا راہِ اعتدال پر قائم رہنے والی امت) بنا دیا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آلِ عمران۔ آیت ۱۱۰)

تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی اصلاح و ہدایت) کے لیے نکالا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

علاوہ بریں جس کام پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے پہلے کے تمام انبیاء مامور تھے وہ قرآن مجید کی رُو سے یہ تھا کہ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ[۴۲] (دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ)۔ غیر مسلم دنیا کے مقابلے میں آپ کی ساری جد و جہد صرف اس غرض کے لیے تھی کہ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ[۴۳] (دین پورا کا پورا صرف اللہ کے لیے ہو جائے)۔ اور تمام انبیاء کی امتوں کی طرح آپ کی امت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ کا حکم یہ تھا کہ لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ[۴۴] (یکسو ہو کر اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے)۔ اس لیے آپ کی قائم کردہ ریاست کا اصل کام ہی یہ تھا کہ دین کے پورے نظام کو قائم کرے، اور اس کے اندر کوئی ایسی آمیزش نہ ہونے دے جو مسلم معاشرے میں دو رنگی پیدا کرنے والی ہو۔ اِس آخری نکتے کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب اور جانشینوں کو سختی کے ساتھ متنبہ فرما دیا کہ:

من احدث فی امرنا ھٰذا ما لیس منه فھو ردّ[۴۵]

جو شخص ہمارے اِس دین میں کوئی ایسی بات نکالے جو اس کی جنس سے نہ ہو اس کی بات مردود ہے۔

---

[۴۲] الشوریٰ، ۱۳

[۴۳] الانفال، ۳۹

[۴۴] البیّنہ، ۵

[۴۵] مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسّنہ

ایاکم ومحدثات الامور فان کل محدثة بدعة وکل بدعة ضلالة۔[۴۶]
خبردار! نرالی باتوں سے بچنا، کیونکہ ہر نرالی بات بدعت ہے، اور ہر بدعت گمراہی۔

من وقر صاحب بدعة فقد اعان علی ھدم الاسلام[۴۷]
جس نے کسی بدعت نکالنے والے کی توقیر کی اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی۔

اسی سلسلے میں آپ کا یہ ارشاد بھی ہمیں ملتا ہے کہ تین آدمی خدا کو سب سے زیادہ ناپسند ہیں اور ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو:

مبتغ فی الاسلام سنة الجاھلیة[۴۸]
اسلام میں جاہلیت کا کوئی طریقہ چلانا چاہے۔

۹۔ **امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا حق اور فرض** اس ریاست کے قواعد میں سے آخری قاعدہ جو اس کو صحیح راستہ پر قائم رکھنے کا ضامن تھا، یہ تھا کہ مسلم معاشرے کے ہر فرد کا نہ صرف یہ حق ہے بلکہ یہ اس کا فرض بھی ہے کہ کلمۂ حق کہے، نیکی اور بھلائی کی حمایت کرے، اور معاشرے یا مملکت میں جہاں بھی غلط اور ناروا کام ہوتے نظر آئیں ان کو روکنے میں اپنی امکانی حد تک پوری کوشش صرف کردے۔ قرآن مجید کی ہدایات اس باب میں یہ ہیں:

تَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔[۴۹]
نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں تعاون نہ کرو۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا۔[۵۰]
اے لوگو جو ایمان لاتے ہو، اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو۔

---

[۴۶] مشکوٰۃ، باب الاعتصام بالکتاب والسنہ

[۴۷] 〃 〃 〃

[۴۸] 〃 〃 〃

[۴۹] المائدہ، ۲

[۵۰] الاحزاب، ۷۰

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۔ (النساء - ۱۳۵)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو. انصاف پر قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو، خواہ تمہاری گواہی خود تمہارے اپنے خلاف یا تمہارے والدین یا قریبی رشتہ داروں کے خلاف پڑے۔
اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ . . . وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ[۵۱]	منافق مرد اور عورتیں ایک تھیلی کے چٹے بٹے ہیں؛ وہ برائی کا حکم دیتے اور بھلائی سے روکتے ہیں . . . اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، وہ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔

قرآن میں اہلِ ایمان کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ

اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ[۵۲]	نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے منع کرنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اس معاملہ میں حسبِ ذیل ہیں:

من رأى منكم منكرا فليغيره بيده فان لم يستطع فبلسانه، فان لم يستطع فبقلبه وذالك اضعف الايمان[۵۳]	تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے اسے چاہیے کہ اس کو ہاتھ سے بدل دے. اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے، اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے (برا سمجھے اور روکنے کی خواہش رکھے) اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

---

[۵۱] التوبہ، ۶۷-۷۱

[۵۲] التوبہ، ۱۱۲

[۵۳] مسلم، کتاب الایمان، باب ۲۰ - ترمذی، ابواب الفتن، باب ۱۲ - ابو داؤد، کتاب الملاحم، باب ۱۷ - ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب ۲۰۔

ثم انها تخلف من بعدهم خلوف یقولون مالا یفعلون و یفعلون مالا یومرون، فمن جاھدھم بیدہٖ فھو مومن ومن جاھدھم بلسانہ فھو مومن ومن جاھدھم بقلبہٖ فھو مومن ولیس وراء ذٰلک حبۃ خردل من الایمان[۵۴]

پھر ان کے بعد نالائق لوگ ان کی جگہ آئیں گے۔ کہیں گے وہ باتیں جو کریں گے نہیں اور کرینگے وہ کام جن کا انہیں حکم نہیں دیا گیا ہے۔ پس جو ان کے خلاف ہاتھ سے جدوجہد کرے وہ مومن ہے، اور جو ان کے خلاف زبان سے جہاد کرے وہ مومن ہے، اور جو ان کے خلاف دل سے جہاد کرے وہ مومن ہے، اور اس سے کم تر ایمان کا ذرہ برابر بھی کوئی درجہ نہیں ہے۔

افضل الجہاد کلمۃ عدل (او حق) عند سلطان جائر[۵۵]

سب سے افضل جہاد ظالم حکمران کے سامنے انصاف کی (یا حق کی) بات کہنا ہے۔

ان الناس اذا راوا الظالم فلم یاخذوا علیٰ یدیہ اوشک ان یعمھم اللہ بعقابٍ منہ[۵۶]

لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کے ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ ان پر عذابِ عام بھیج دے۔

انہ سیکون بعدی امراء، من صدقھم بکذبھم واعانھم علیٰ ظلمھم فلیس منی ولست منہ[۵۷]

میرے بعد کچھ لوگ حکمراں ہونے والے ہیں۔ جو اُن کے جھوٹ میں ان کی تائید کرے اور ان کے ظلم میں ان کی مدد کرے وہ مجھ سے نہیں اور مَیں اُس سے نہیں۔

---

[۵۴] مسلم، کتاب الایمان، باب ۲۰

[۵۵] ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب ۱۷۔ ترمذی، کتاب الفتن، باب ۱۲۔ نسائی، کتاب البیعۃ، باب ۳۶۔ ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب ۲۰۔

[۵۶] ابوداؤد، کتاب الملاحم، باب ۱۷۔ ترمذی، کتاب الفتن، باب ۱۲۔

سیکون علیکم ائمۃ یملکون ارزاقکم یحدثونکم فیکذبونکم ویعملون فیسیئون العمل لا یرضون منکم حتی تحسنوا قبیحہم وتصدقوا کذبہم فاعطوھم الحق ما رضوا بہ فاذا تجاوزوا فمن قتل علی ذالک فھو شہید[58]

عنقریب تم پر ایسے لوگ حاکم ہونگے جن کے ہاتھ میں تمہاری روزی ہوگی۔ وہ تم سے بات کرینگے تو جھوٹ بولیں گے اور کام کریں گے تو بُرے کام کرینگے۔ وہ تم سے اس وقت تک راضی نہ ہونگے جب تک تم ان کی بُرائیوں کی تعریف اور ان کے جھوٹ کی تصدیق نہ کرو۔ پس تم ان کے سامنے حق پیش کرو جبتک وہ اسے گوارا کریں۔ پھر اگر وہ اس سے تجاوز کریں تو جو شخص اس پر قتل کیا جائے وہ شہید ہے۔

من ارضی سلطاناً بما یسخط ربہ خرج من دین اللہ[59]

جس نے کسی حاکم کو راضی کرنے کے لیے وہ بات کی جو اس کے رب کو ناراض کر دے وہ اللہ کے دین سے نکل گیا۔

---

[57] نسائی، کتاب البیعہ، باب ۳۴-۳۵۔

[58] کنز العمال، ج ۶، ح ۲۹۷

[59] کنز العمال، ج ۶، ح ۳۰۹

ضروری گذارش

خریداران ترجمان القرآن سے التماس ہے کہ خط و کتابت کرتے وقت اپنے نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دیا کریں جو کہ ان کے پتہ کی چٹ پر درج ہوتا ہے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت کا دفتر ذمہ دار نہیں ہوگا۔

منیجر ترجمان القرآن

تعمیرِ اخلاق کیوں اور کیسے؟

ابوالاعلیٰ مودودی

(ایک انٹرویو جو "اردو ڈائجسٹ" لاہور کو دیا گیا)

اخلاق حقیقت میں انسانیت کا اصل جوہر اور انسان و حیوان کے درمیان وجہِ امتیاز ہے۔ دُنیا اور آخرت میں انسان کی کامیابی کا دار و مدار اخلاق ہی پر ہے۔ کوئی انسان اپنی انفرادی حیثیت میں، اور کوئی انسانی گروہ اپنی اجتماعی حیثیت میں اخلاق کے بغیر کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کو اپنے استحکام کے لیے کچھ بنیادی اخلاقیات کی ضرورت نہ ہو۔ کیا آپ کو امن میسر آسکتا ہے اگر آپ کے شہروں اور بستیوں میں انسانی زندگی کا احترام اور دوسروں کے حقوق کا پاس و لحاظ موجود نہ ہو؟ کیا آپ کا معاشرہ تباہی سے بچ سکتا ہے اگر اس میں ہر شخص قدرت پا کر اپنے حدود سے تجاوز کرنے اور دوسروں کی جان و مال اور آبرو پر دست درازی کر گزرنے کا خوگر ہو؟ کیا آپ کسی تہذیب کا تصوّر کر سکتے ہیں اگر افراد اور گروہوں کے برتاؤ کو ضابطہ میں رکھنے کے لیے کوئی معقول قانون موجود نہ ہو، یا موجود تو ہو مگر اس کی پابندی نہ کی جاتی ہو؟ کیا آپ کوئی مضبوط تمدنی نظام چلا سکتے ہیں اگر آپ کی معاشرت اور سیاست اور معیشت میں دیانت و امانت، عدل و انصاف، فرض شناسی اور راست بازی موجود نہ ہو؟ بلکہ میں پوچھتا ہوں، کیا آپ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنے وجود کو بھی بچا سکتے ہیں اگر آپ کے افراد میں وہ خود غرضی پرورش پا رہی ہو جو ان کے دلوں میں اپنی ذات اور ذاتی مفاد سے بالاتر کسی چیز کی وفاداری کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ چھوڑے؟

ایک مسلمان کی حیثیت سے آپ دیکھیں تو اخلاق کی پستی کے ساتھ ہم سرے سے کسی اسلامی زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ مسلمان تو مسلمان بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ اس کی ذات سے دنیا میں بھلائی قائم ہو اور برائی مٹے۔ بھلائی کو مٹانا اور بُرائی پھیلانا، اور پھر اس کے ساتھ مسلمان بھی ہونا، یہ درحقیقت ایک کھلا ہوا تناقض ہے۔ ایک شخص مسلمان ہو اور پھر بھی اُس کے شر سے دوسرے بندگانِ خدا محفوظ نہ ہوں، ایک شخص مسلمان ہو اور پھر بھی اُس پر کسی معاملہ میں اعتماد نہ کیا جا سکے، ایک شخص مسلمان ہو اور پھر بھی وہ نیکی سے بھاگے اور بدی کی طرف لپکے، حرام کھائے اور حرام طریقوں سے اپنی خواہشات پُوری کرے، تو آخر اس کے مسلمان ہونے کا فائدہ کیا ہے۔ کسی مسلم معاشرے کی اس سے بڑھ کر کوئی ذلت نہیں ہو سکتی کہ وہ انصاف سے خالی اور ظلم سے لبریز ہوتا چلا جائے، اس میں روز بروز بھلائیاں دبتی اور بُرائیاں فروغ پاتی چلی جائیں، اور اس کے اندر دیانت و امانت اور شرافت کے لیے پھلنے پھولنے کے مواقع کم سے کم تر ہوتے چلے جائیں۔ یہ خدا کے غضب کو دعوت دینے والی حالت ہے۔ اگر کسی مسلم معاشرے کی یہ حالت ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اسلام کی رُوح سے خالی ہو چکا ہے۔ صرف اسلام کا نام ہی اس میں باقی رہ گیا ہے، اور یہ نام بھی اب صرف اس لیے رہ گیا ہے کہ دنیا کو اس دینِ حق سے دُور بھگاتا رہے۔

مسلمان اخلاقی زوال کی طرف جاتا ہی اس وقت ہے جب اسے خدا کی رضا اور آخرت کی فلاح مطلوب نہیں رہتی اور صرف دنیا اس کی مطلوب بن کر رہ جاتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اخلاق کی پستی کے ساتھ کوئی قوم دنیا کی کامیابی بھی حاصل نہیں کر سکتی۔ اس پستی کے ساتھ تو آخرت بھی ہاتھ سے جاتی ہے اور دنیا بھی ہاتھ نہیں آتی۔

سب سے بڑھ کر دولت کی پیاس ہم کو دنیا طلبی کی طرف لے جا رہی ہے، مگر اس کے لیے ہم نے افراد اور طبقوں کی خود غرضی اور بد دیانتی کو وسیلہ بنایا ہے، حالانکہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز ہماری معاشی ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہے۔ مجھے مشرقِ اوسط کے متعدد ملکوں میں جانے

کا اتفاق ہوا ہے۔ وہاں میں نے جب تاجروں سے کہا کہ آپ جو مال باہر کے بعض غیر مسلم ممالک سے منگاتے ہیں وہ آپ کے ایک بھائی مسلمان ملک۔ پاکستان سے بھی مل سکتا ہے، اسے چھوڑ کر آپ دوسروں سے کیوں خریدتے ہیں؟ تو ان کا یہ جواب سن کر میں شرم سے پانی پانی ہو گیا کہ ہم نے مجبوراً پاکستان سے مال منگانا بند کیا ہے۔ وہاں سے نمونہ اچھا دکھا کر فرمائش حاصل کی جاتی ہے اور پھر اس کی تعمیل میں ردی مال بھیج دیا جاتا ہے۔ فرمائیے، کیا اس بد دیانتی کے ساتھ ہم تجارت میں کوئی ترقی کر سکتے ہیں؟ ہمارے کارخانہ دار اور بڑے تاجر جس خود غرضی کے ساتھ بے تحاشا منافع خوری کر رہے ہیں اس سے ایک محدود طبقہ تو بلاشبہ فربہ ہوتا جا رہا ہے، مگر قوم بحیثیت مجموعی لاغر ہو رہی ہے۔ یہ چیز آخر کب تک ہمیں اس طبقاتی کشمکش کی آگ میں جھلسنے سے بچا سکے گی جس میں اسی طرح کی حماقتیں کرنے والے بہت سے دوسرے ملک جھلس چکے ہیں۔ پھر اسی خود غرضی کی بدولت ہمارے کارکن طبقوں میں کام چوری اور اپنے فرض سے غفلت اور صرف اپنے حقوق کے لیے لڑنے کی جو بیماری پھیل رہی ہے کیا واقعی یہ وہی راستہ ہے جس سے ہم معاشی ترقی کی طرف پیش قدمی کر سکیں گے؟

ہم ایک مدت سے مادی ترقی کے لیے تعلیم تعلیم کا شور مچا رہے ہیں۔ مگر ہماری تمام کوششیں صرف کتاب خواں بنانے میں صرف ہوتی رہی ہیں۔ انسان بنانے اور مسلمان بنانے کی ہم نے کوئی فکر نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس ہماری تعلیم گاہیں دھڑا دھڑ ایسے افراد تیار کر کر کے نکال رہی ہیں جو انسانی اخلاق سے بھی عاری ہیں اور اسلامی اخلاق سے بھی۔ ہمارے نصابِ تعلیم، اور طرزِ تعلیم اور تعلیمی ماحول میں سرے سے اس فکر کا کوئی نشان نہیں ملتا کہ ہمیں اپنے افراد میں کوئی قومی سیرت بھی پیدا کرنی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ حکومت سمیت ہمارے تمام شعبہ ہائے حیات کو جو کارکن مل رہے ہیں ان کے اندر کوئی قابلِ اعتماد کیرکٹر نہیں پایا جاتا۔ قلیل مستثنیات کو چھوڑ کر، جو روز بروز قلیل سے قلیل تر ہوتے جا رہے ہیں، ہمارے ہر شعبۂ زندگی کو ادنیٰ مراتب سے لے کر بلند ترین مناصب تک وہ لوگ چلا رہے ہیں جن کے اندر دیانت، امانت اور فرض شناسی کا فقدان ہے۔ جنہیں ذرا سا لالچ، یا تھوڑا سا خوف بھی راستی سے بآسانی ہٹا سکتا ہے۔ جو اپنے معمولی سے

فائدے کے لیے دوسروں کو، حتیٰ کہ اپنی قوم اور اپنے ملک تک کو بڑے سے بڑا نقصان پہنچا دینے میں تامّل نہیں کرتے۔ جن کی نگاہ میں ضمیر و ایمان کی کوئی قیمت نہیں۔ جنہیں اپنی ذاتی اغراض کے لیے کسی اصول اور ضابطے کو توڑ دینے میں کوئی باک نہیں۔ رُوحانی ترقی کا سوال تو بہت اونچا ہے، کیا یہ تعلیم کسی مادی ترقی میں بھی ہمارے لیے واقعی مددگار ہو سکتی ہے؟ جس کیرکٹر میں امانتوں کا بوجھ سہارنے اور خوف و طمع کے مقابلے میں ٹھیر جانے کی طاقت نہ ہو وہ حیاتِ دنیا کے کسی میدان میں بھی آخر ہمیں کتنی دُور لے جا سکتا ہے۔

ہماری اصل طاقت وہ مادی ذرائع نہیں ہیں جو خالق نے ہمیں عطا کیے ہیں بلکہ وہ انسان ہیں جنہیں ان ذرائع سے کام لینا ہے۔ یہ انسان اگر بگڑ جائیں تو مادی ذرائع ہمارے کس کام آسکتے ہیں ان کے بگاڑ اور اس بگاڑ کے اثرات کو ہم محض حکومت اور قانون کی طاقت سے نہیں روک سکتے، کیونکہ اس طاقت کے کارگر ہونے کا انحصار بھی اُن انسانوں کی سیرت و کردار ہی پر ہے جو اس طاقت کو استعمال کریں۔ دنیا میں کوئی بہتر سے بہتر قانون بھی کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا اگر اس کے نافذ کرنے والے خود اس کو توڑیں اور اسے اپنی بدکرداریوں کے لیے ہتھیار بنانے پر تُل جائیں۔ ہر پابندی جو آپ کسی خرابی کو روکنے کے لیے لگائیں گے، ایک بددیانت نظم و نسق کے لیے وہ ناجائز فائدے اٹھانے کا ایک نیا دروازہ کھول دے گی اور اصلاح کے بجائے مزید خرابی کی موجب بن جائے گی۔ آپ کا قانون اپنی جگہ خواہ کتنا ہی معقول اور منصفانہ ہو، وہ معاشرے میں عدل قائم کرنے کا معجزہ نہیں دکھا سکتا اگر انصاف کی کرسی پر بیٹھنے والے ہی انصاف کا خون کرنے لگیں، اور قانون کی گرفت میں لانے والی مشینری ہی ظلم پر کمربستہ ہو جائے۔ دوسری طرف دیکھیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ موجودہ زمانے کی کُلّیت پسندی نے ہر ملک کے قدرتی ذرائع و وسائل کو بہت بڑی حد تک حکومت کے کنٹرول میں دے دیا ہے۔ کوئی قوم بھی براہِ راست ان سے انتفاع نہیں کرتی بلکہ حکومت اس انتفاع کو منضبط کرتی ہے اور حکومت کے اس فریضے کو اس کے کارکن ہی انجام دیتے ہیں۔ ان کارکنوں کے ایماندار، فرض شناس اور بااصول ہونے کی

صورت میں خدا کے دیئے ہوئے ذرائع و وسائل سے جتنا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اس کا عشر عشیر بھی ایسی حالت میں نہیں اٹھایا جاسکتا جبکہ ان کارکنوں کو رشوت، خیانت، کام چوری، سفارش، خویش پروری، اور خودغرضی کی بیماریاں لگی ہوئی ہوں، اور آئین وضابطہ کا کوئی احترام ان کے اندر موجود نہ ہو۔ خود حکومت کو بھی جو آمدنی ٹیکسوں اور دوسرے ذرائع سے ہوسکتی ہے، بددیانت کارکنوں کی وجہ سے نہ وہ کبھی پوری طرح وصول ہوتی ہے اور نہ اس کا صحیح استعمال ہی پوری طرح ہوتا ہے۔

یہ تو اُس حالت کی بات ہے جبکہ آئین وقانون بجائے خود درست ہو، اور کارفرما بھی صحیح قسم کے لوگ ہوں، صرف کارکن بگڑے ہوئے ہوں۔ لیکن جہاں آئین وقانون تک میں بکثرت بے انصافیاں اور صریح غیر معقول باتیں موجود ہوں، اور کارفرما اخلاقی بگاڑ میں کارکنوں کے ساتھ نہ صرف برابر کے شریک ہوں، بلکہ ان سے خود کام لیتے ہوں، وہاں بگاڑ اپنی انتہا کو پہنچ جاتا ہے، اور حکومت ذریعۂ اصلاح کے بجائے الٹی موجبِ فساد بن جاتی ہے۔

ہم نے کارفرماؤں اور قانون سازوں کے انتخاب کے لیے جمہوریت کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ لیکن یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ "جمہوریت" کے نام میں کوئی معجزہ نہیں ہے جو آپ سے آپ اس انتخاب کو صحیح بنا دے۔ جمہوریت خود بھی اپنی کامیابی کے لیے چند اخلاقی اوصاف کی محتاج ہے جو اگر موجود نہ ہوں تو وہ سرے سے چل ہی نہیں سکتی۔ اس کے لیے کم سے کم جو اوصاف مطلوب ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ جس قوم میں جمہوریت رائج کی جارہی ہو اس کے اندر خود اپنے حقوق کا صحیح شعور اور ان کی حفاظت کا مضبوط ارادہ موجود ہو۔ وہ مجموعی حیثیت سے اتنی جرأت وہمت رکھتی ہو کہ کسی استبداد کو اپنے اُوپر مسلط نہ ہونے دے۔ اور اس کے افراد کی اکثریت کسی لالچ کی بنا پر اپنی رائے بیچنے، یا خوف کی بنا پر اپنے ضمیر کے خلاف رائے دینے، یا کسی خودغرضی یا بے جا عصبیت کی بنا پر نااہل لوگوں کے حق میں رائے دینے کے لیے تیار نہ ہو۔

۲- اس کے نظم ونسق کو چلانے والے کارکنوں اور اس کے دفاع کی خدمت انجام دینے والے سپاہیوں میں اتنی حب الوطنی، اتنی آئین پسندی، اور خود جمہوریت کے تصور کے ساتھ اتنی وفاداری موجود ہو کہ وہ نہ تو جمہوریت کی جگہ کسی استبداد کو اپنے ملک پر مسلط کرنے کی سازش میں آلۂ کار بنیں اور نہ آئین وقانون کے خلاف کوئی اُن کو استعمال کر سکے۔ انہیں ایمانداری کے ساتھ جمہوریت کے اس نظریے کا قائل ہونا چاہیے اور اس پر سختی کے ساتھ کاربند رہنا چاہیے کہ "حکمرانی دراصل قوم کے نمائندوں کا کام ہے جنہیں قوم اپنی آزاد مرضی سے اپنا نمائندہ بناتے اور ملازمین حکومت کا کام یہ ہے کہ قوم جن لوگوں کو بھی اپنا نمائندہ منتخب کرے، وہ ان کے ماتحت کام کریں"۔ ان کے ضمیر میں اتنی طاقت ہونی چاہیے کہ وہ قوم سے انتخاب کی آزادی سلب کرنے کے لیے نہ خود آمادہ ہوں اور نہ کوئی ان سے یہ خدمت لے سکے۔

۳- قوم کے بااثر لوگوں میں اکثریت ایسے افراد کی ہونی چاہیے جو خود غرضی میں اتنے اندھے نہ ہو جائیں کہ اپنے اقتدار کا تخت بچھانے کے لیے خود اپنی قوم کو اور اپنے ملک کے ملازمین حکومت کو ضمیر فروشی، بزدلی اور بددیانتی کی تربیت دینے پر تُل جائیں۔ ان میں اگر اقتدار کی طلب ہو بھی تو بدرجۂ آخر وہ حدود آشنا ہونی چاہیے۔ وہ اقتدار کو خریدنے یا زبردستی کھسوٹ لینے کے بجائے خدمت اور حسنِ عمل کے ذریعہ سے قوم میں اپنا اعتماد پیدا کریں اور پھر عوام کی مرضی (یعنی آزاد مرضی) سے، اگر وہ ان کو حاصل ہو جائے، تو برسرِ اقتدار آئیں۔

یہ تین شرطیں جہاں نہ پائی جاتی ہوں وہاں درحقیقت کوئی جمہوریت نہ قائم ہو سکتی ہے، نہ چل سکتی ہے۔ آزادی اور جمہوریت کا بوجھ مضبوط ستون اور شہتیر ہی سنبھال سکتے ہیں۔ بودے اور گھن کھاتے ہوتے ستونوں اور شہتیروں پر یہ بوجھ جہاں بھی لادا جائے گا، زمین بوس ہو جائے گا۔ نام جمہوریت کا ہوگا مگر استبداد کارفرما ہوگا۔ ناجائز ذرائع سے برسرِ اقتدار آنے والے لوگ کبھی نیک نیت نہیں ہو سکتے۔ وہ قانون سازی اور کارفرمائی، دونوں میں حق وانصاف کے بجائے اپنی اغراض کو بالاتر رکھیں گے۔ ایسی صورت میں سرے سے نہ تو قانون کا احترام باقی رہ سکتا ہے

اور نہ حکومت کی طاقت بگاڑ کے بجائے اصلاح کی خدمت انجام دے سکتی ہے۔

سب سے بڑی مصیبت ہمارے لیے یہ ہے کہ ہمارے اخلاق کی تعمیر جن بنیادوں پر ہوئی تھی وہی سرے سے منہدم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ خدا اور رسول اور قرآن اور آخرت پر ایمان وہ اولین چیز ہے جس پر ایک مسلمان فرد اور قوم کے اخلاق کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ مگر ہمارا نظامِ تعلیم، طرزِ تعلیم اور تعلیمی ماحول اس بنیاد کو مضبوط کرنا تو درکنار، اسے قائم رکھنا بھی درکنار، روز بروز اسے کمزور سے کمزور تر کرتا چلا جا رہا ہے اور اس کے برعکس ایک لادینی تہذیب کے تصورات، اقدار اور طور طریقوں کی برتری کا نقش دلوں پر بٹھا رہا ہے۔ کسی کو محسوس نہیں ہوتا کہ یہ حرکت کر کے ہم دراصل خود اپنی قومی خودی کی بیخ کنی کر رہے ہیں۔ پھر دوسری چیز حرام و حلال کی وہ تمیز تھی جس کے بقا و استحکام پر ہمارے اخلاق کے بقا و استحکام کا انحصار تھا۔ مگر ہم اسے بچانے اور سنبھالنے کے بجائے اس کی جڑ کاٹنے میں لگے ہوئے ہیں۔ ہمارا پورا معاشی نظام سُود پر چل رہا ہے جیسے ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلام نے اس کو حرام کیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں شراب نوشی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، حالانکہ دنیا کی قوموں میں مسلمانوں کا یہ امتیازی وصف تھا کہ ان کے معاشرے نے شراب کا سدِباب کرنے میں سب سے بڑھ کر کامیابی حاصل کی ہے۔ ہمارے ہاں جنسی بداخلاقی بھی روز افزوں ہے اور ہم مغرب کی تقلید میں عُریانی، بے حیائی، اختلاطِ مرد و زن، فحش لٹریچر، فحش فلموں اور فحش گانوں کے ذریعہ سے اس کو فروغ دیتے چلے جا رہے ہیں، حالانکہ مسلم معاشرہ کبھی اس لحاظ سے بھی دنیا کے تمام معاشروں سے بلند اخلاق کا حامل تھا۔ ان شدید ترین حرمتوں کو توڑ دینے کے بعد اس کا آخر کیا امکان ہے کہ ہمارے عوام اور خواص میں سرے سے کوئی تمیزِ حرام و حلال باقی رہ جائے اور وہ رشوت، خیانت، غبن، غصب، چوری اور ایسے ہی دوسرے حرام افعال سے اجتناب کریں۔

تیسری اہم چیز وہ قدریں ہیں جو ہم کو اخلاق کی بلندی پر قائم رہنے کے لیے اپنے دین سے اور اپنی ملّی روایات سے ملی تھیں۔ حق پسندی و حق شناسی، عدل و انصاف، دیانت و امانت، راستبازی، قناعت، حیا، عفت، مروّت، اور سب سے بڑھ کر تقویٰ اور احسان وہ چیزیں تھیں جو مسلمان

ہونے کی حیثیت سے ہمارے لیے اصل میں قابلِ قدر ہونی چاہیے تھیں۔ مگر ہم نے ان کی جگہ خوشحالی، شاندار زندگی، چودھراہٹ، غلبہ واقتدار، اور عیش کو قابلِ قدر ٹھیرا لیا ہے، قطعِ نظر اس سے کہ وہ کسی ذریعہ سے میسّر ہو۔

اب آپ پوچھیں گے کہ اخلاقی پستی کے اس گڑھے میں گرنے سے اور اس کے تباہ کن نتائج سے ہم کیسے بچ سکتے ہیں؟ میں عرض کروں گا کہ یہ سوال آپ خلا میں نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک خاص ملک اور خاص قوم میں کر رہے ہیں جس کا ایک خاص مزاج صدیوں کی روایات سے بنا ہوا ہے، اور ایسی حالت میں کر رہے ہیں کہ ایک مدتِ دراز سے آپ کے لیے مادّی ترقی اور معیارِ زندگی کی بلندی کا سوال سب سے زیادہ اہم اور اخلاق کا سوال سب سے زیادہ غیر اہم بنا رہا ہے، حتٰی کہ تعمیرِ اخلاق کے لیے اجتماعی کوشش کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی ہے۔

اِس حالت میں سب سے پہلے تو اِس ضرورت کا احساس پیدا ہونا چاہیے، اور یہ احساس عوام سے بڑھ کر خواص اور ملک کے کارفرماؤں میں ہونا چاہیے۔ جب تک وہ یہ نہ جانیں گے کہ اخلاق کے بغیر ہمارے لیے کسی ترقی کا، بلکہ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے بقا کا بھی امکان نہیں ہے، اُس وقت تک قومی پیمانے پر تعمیرِ اخلاق کے لیے کچھ نہ کیا جا سکے گا۔ انفرادی کوششیں تو خدا کے فضل سے ہوتی رہی ہیں۔ ہمارا معاشرہ ایسے افراد سے کبھی خالی نہیں رہا ہے جنہوں نے اپنی حد تک اس کی سعی کی ہو۔ مگر ان کا کوئی نتیجہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا تھا کہ زوال کی رفتار اتنی تیز نہ ہو سکی جتنی اس کے بغیر ہوتی۔ قوم کا اخلاق بنانا بہرحال قومی پیمانے پر کوشش چاہتا ہے، اور وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ ملک کے کارفرماؤں کو اس کی ضرورت کا، اور اس کے نہ ہونے کے تباہ کن نتائج کا احساس ہو۔

احساسِ ضرورت کے بعد یہ جاننا اور سمجھنا بھی ناگزیر ہے کہ تعمیرِ اخلاق کسی بنیادی فلسفے اور کسی نقشۂ تعمیر کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ آپ صرف اخلاق، اخلاق کی رٹ لگا کر، اور محض سطحی طور پر چند معروف اخلاقیات کا اشتہار دے کر تو کوئی قومی اخلاق نہیں بنا سکتے۔ آپ کو لامحالہ ایک اساسی

فلسفہ درکار ہے جس کے لحاظ سے آپ خیر وشر کا امتیاز اور اخلاقی اقدار کا تعین کریں۔ آپ کو ان اخلاقی اقدار کی پشتیبانی کے لیے کچھ عقائد درکار ہیں جو نفوس کے اندر ان کا احترام گہری جڑوں کے ساتھ جما دیں۔ آپ کے سامنے تعمیرِ اخلاق کے لیے کوئی نقشہ بھی ہونا چاہیے جس کے مطابق آپ سیرت و کردار کی بنیادیں اٹھائیں۔ انسان بنانے سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کیسے انسان بنانا چاہتے ہیں، اور یہ بھی جاننا چاہیے کہ اس خاص قسم کے انسان کس طرح بن سکتے ہیں۔

تیسری بات یہ بھی سمجھ لینی چاہیے کہ آپ کسی قوم میں باہر سے کوئی فلسفہ اور نقشہ لاکر تعمیرِ اخلاق نہیں کرسکتے۔ تعمیر اگر ممکن ہے تو اُسی فلسفے اور نقشے پر ممکن ہے جو اس خاص قوم کے مزاج اور اس کی روایات میں پہلے سے اپنی گہری جڑیں رکھتا ہو۔ خصوصیت کے ساتھ یہ بات مسلمانوں کے معاملہ میں بہت اہم ہے۔ یہ کوئی وحشی یا نو دولتی قوم نہیں ہے جس کا کوئی ماضی نہ ہو، جس کا اپنا کوئی نظریۂ حیات اور فلسفۂ اخلاق نہ ہو، جو اب نئے سرے سے قومی زندگی کا آغاز کر رہی ہو۔ ایسی قوم میں تو کوئی فلسفہ کہیں سے درآمد کرکے لایا بھی جاسکتا ہے۔ لیکن مسلمان صدہا برس سے اپنے کچھ عقائد رکھتے ہیں۔ کوئی معیارِ خیر وشر رکھتے ہیں۔ کچھ اخلاقی اقدار رکھتے ہیں۔ اور اپنے اِس سرمایے پر آج اس گئی گزری حالت میں بھی اُن کو فخر ہے۔ ان کی تاریخ نے ان کو انسانیت کے کچھ نمونے دیے ہیں جنھیں وہ سیرت و کردار کی بلند ترین مثالیں سمجھتے ہیں اور وہی ان کی نگاہ میں معیارِ کمال ہیں۔ آپ کوئی بیرونی فلسفہ کچھ نئی اقدار اور کچھ نئے معیاروں کے ساتھ لاکر یہاں تعمیرِ اخلاق کرنا چاہیں گے تو آپ کو ایک مدتِ دراز تک اپنی ساری قوتیں اِن پُرانی بنیادوں کو منہدم کرنے اور نئی بنیادیں رکھنے میں صرف کرنی پڑیں گی۔ یہ کوشش اس قوم کے رہے سہے اخلاق کا بھی ستیاناس کر دے گی۔ اِس تخریب سے اگر یہ کسی نہ کسی طرح جی بچی تو نئے اخلاق کی تعمیر کر لیجیے گا۔ ایک صدی کے بعد شاید اس تعمیر کے نتائج سامنے آنے شروع ہوسکیں۔ لیکن اگر اسلام اور اس کی روایات کی بنیاد پر آپ تعمیرِ اخلاق کرنا چاہیں تو کل ہی سے یہ کام

شروع ہو سکتا ہے، اور ہر نیا آنے والا دن اس کے اثرات و نتائج سامنے لا سکتا ہے، بشرطیکہ آپ تعمیر کے ساتھ ساتھ تخریب کا کام جان بوجھ کر نہ کرتے رہیں۔

اسلام کی بنیادوں پر تعمیرِ اخلاق کے تصوّر کو کسی محدود معنی میں نہ لیجیے۔ اس کے لیے آپ کو اپنا پورا انتظامِ تعلیم اپنے نصاب اور طریقوں اور ماحول سمیت بدلنا ہوگا۔ اس کے لیے افکار بنانے والے تمام ذرائع ریڈیو، سینما، ٹیلیویژن، صحافت، لٹریچر وغیرہ، صحیح و مناسب طریقے سے استعمال کرنے ہونگے، اور ان کے غلط استعمال کو روکنا ہو گا۔ اس کے لیے منتظمینِ حکومت تیار کرنے والے اور دفاعی خدمات کی تربیت دینے والے اداروں کے طرزِ تربیت میں بھی تبدیلی کرنی ہو گی۔ اس کے لیے قوانین کی اصلاح بھی کرنی ہو گی اور پوری انتظامی پالیسی میں بھی تغیّر کرنا ہو گا۔ اور سب سے بڑھ کر، اس کے لیے ہمارے کارفرماؤں کو اپنی نیتوں اور ارادوں اور طور طریقوں کو بدلنا ہو گا اور انتخابات جیتنے، اقتدار حاصل کرنے اور اقتدار پر قابض رہنے کے ذرائع و وسائل کی اصلاح بھی کرنی ہو گی۔ یہ درحقیقت کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بڑا دشوار کام ہے جس پر طبیعتیں بمشکل اُس وقت ہی آمادہ ہو سکتی ہیں جب عام و خاص، سب کو یہ محسوس ہو جائے کہ قوم اگر ڈوبی تو یہاں کوئی تیرنے والا نہ رہ سکے گا۔

ضروری اعلان

منصبِ رسالت نمبر کی چند کاپیاں دفتر ترجمان القرآن میں برائے فروخت موجود ہیں۔ قیمت فی کاپی ۳/۵۰ روپے ہے۔ مگر اب فی کاپی ۲ روپے مع ڈاک خرچ کے جو اصحاب چاہیں دفتر سے منگوا سکتے ہیں۔

مینیجر ترجمان القرآن

اچھرہ، لاہور

رسائل و مسائل

خواب کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر

سوال - خواب کے متعلق یہ امر تحقیق طلب ہے کہ خواب کیسے بنتا ہے؟ اور اس معاملہ میں اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے ۔ فرائیڈ کے نزدیک لاشعور کی خواہشات شعور میں آنا چاہتی ہیں مگر سوسائٹی کی بندشوں اور انا (EGO) کے دباؤ سے لاشعور میں دبی رہتی ہیں۔ رات کو سوتے وقت شعور سو جاتا ہے اور لاشعور چپکے سے ان خواہشات کو شعور میں لے آتا ہے مگر ان خواہشوں کو لاشعور بھیس بدلوا دیتا ہے ۔ (فرائیڈ کے نزدیک سب خواب جنسی نوعیت کے (SEXUAL) ہوتے ہیں) چنانچہ جاگنے کے بعد خواب میں جو کچھ دیکھا تھا اس کے لیے فرائیڈ MANIFEST CONTENT کی حد استعمال کرتا ہے۔ اور یہ اپنے اندر علامتیں SYMBOLS رکھتا ہے۔ جن کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ خواب کا اصل مطلب ان علامتوں کی تعبیر کر کے پتہ چلتا ہے۔ اور اصل مطلب کیا ہے ان علامتوں کا؟ یہ لاشعوری خواہشات میں چھپا ہوتا ہے۔ ان لاشعوری خواہشات کے لیے فرائیڈ LATENT CONTENT کی حد استعمال کرتا ہے۔ نفسیات کے نزدیک تعبیر خواب دراصل یہ ہے کہ MANIFEST CONTENT یعنی ظاہر خواب سے اور اس کی علامتوں سے LATENT THOUGHT معلوم کیا جائے اس کے لیے نفسیات دان FREE ASSOCIATION کی تکنیک استعمال کرتے ہیں۔ اور خواب کی علامتوں SYMBOLS کو جنسی معنی پہناتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اسلام کے نزدیک :

۱- خواب کس طرح تشکیل پاتا ہے ؟

۲- اِس کی علامتوں کے معنی کیسے جانے جاتے ہیں یعنی کس تکنیک سے ؟ انبیاء و صحابہ کرام کس طرح علامتوں کو معنی دیتے تھے ؟

۳- کیا معیار ہے کہ جو معانی خوابوں کی علامات کو ہم نے پہناتے ہیں وہ اسلامی نظریۂ خواب و تعبیر کے مطابق ہیں ؟

اس سلسلے میں مزید چند سوالات یہ ہیں :

(ا) علامہ ابن سیرینؒ اور صحابہ کرامؓ کی تعبیراتِ خواب قرآنی نظریۂ خواب کہلائیں گی یا "مسلم مفکرین کا نظریۂ خواب و تعبیر" کے تحت ان کو لایا جائے گا۔

(ب) کیا وقت بھی خوابوں کی سچائی کی مقدار پر اثر انداز ہوتا ہے ؟ جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ صبح کا خواب زیادہ سچا ہوتا ہے۔

(ج) اس کا کیا مطلب ہے کہ "خواب نبوت کے چھیالیس حصّوں میں سے ایک ہے" (بخاری شریف)

جواب - موجودہ زمانہ کے نفسیات دان دو امراض میں مبتلا ہیں ایک یہ کہ وہ کسی عالمِ بالا کے قائل نہیں ہیں جو انسان پر اور اس کے گرد وپیش کی کائنات پر اثر انداز ہوتا ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ بنیادی طور پر انسان کو صرف ایک ذی شعور حیوان سمجھتے ہیں اور اس کے اندر حیاتیاتی زندگی BIOLOGICAL LIFE سے بالاتر کسی رُوح اور روحانیت کے وجُود کو نہیں مانتے۔ اسی لیے انہوں نے خواب کی وہ توجیہات کی ہیں جو آپ کو فرائڈ وغیرہ کے ہاں نظر آتی ہیں۔

اسلام چونکہ عالمِ بالا کا بھی قائل ہے اور انسان کے اندر روح کے وجود کو بھی مانتا ہے اس لیے اسے خواب کی اِن توجیہات سے قطعی انکار ہے۔ وہ خواب کو دو بڑی اقسام پر تقسیم کرتا ہے۔ ایک رُویائے صادقہ۔ دوسرے اضغاثِ اَحلام۔

رویائے صادقہ، جیسا کہ خود اس کے اصطلاحی نام ہی سے ظاہر ہے، سچے خواب کو کہتے

ہیں یعنی ایسا خواب جو شعور کی مداخلت سے آزاد ہو کر ملاء اعلیٰ کے ساتھ انسانی روح کا ربط قائم ہو جانے کے نتیجے میں نظر آتا ہے۔ اس حالت میں بسا اوقات آدمی کسی حقیقت کو، یا کسی ہونے والے واقعہ کو بالکل اصلی شکل میں دیکھتا ہے۔ کبھی آدمی کو کسی مسئلے میں بالکل صریح اور صاف علم یا مشورہ دیا جاتا ہے اور آدمی یوں محسوس کرتا ہے کہ گویا اس نے دن کی صاف روشنی میں بحالتِ بیداری کوئی بات سنی یا کوئی چیز دیکھی ہے۔ اور کبھی آدمی کو یہ امور کسی علامتی تمثیل کی شکل (SYMBOLIC FORM) میں نظر آتے ہیں جس کے معنی متعین کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ تعبیرِ خواب میں بصیرت رکھنے والے ان تمثیلات کے معنی بسا اوقات بالکل ٹھیک ٹھیک متعین کر لیتے ہیں۔ اور اگر اس طرح وہ متعین نہ ہوں تو بعد میں کسی وقت جب ان کی تعبیر عملاً سامنے آجاتی ہے تب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں خواب جو ہم نے دیکھا تھا اور اس کے معنی ہم نہ سمجھ سکے تھے، اس کی صحیح تعبیر یہ تھی۔ ان تمثیلی اشکال کی تعبیر کے صحیح طریقے کی طرف ہماری رہنمائی وہ دو خواب کرتے ہیں جو حضرت یوسف کو نظر آئے تھے اور ان کی تعبیر خود قرآن مجید میں بتائی گئی ہے۔ اس کے بعض اصول ان تعبیروں سے بھی معلوم ہوتے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا بعض صحابۂ کرام اور تابعین نے بعض خوابوں کی بیان کی ہیں۔ لیکن تعبیرِ خواب کا بہت بڑا انحصار خداداد بصیرت پر ہے۔ اس کے کچھ لگے بندھے اصول نہیں ہیں کہ فنِ تعبیر کو ایک سائنس کی طرح منضبط کیا جا سکے اور ہر تمثیلی شکل یا لفظ کے لیے ایک خاص معنی کا تعین کیا جا سکے۔

رہے اضغاثِ احلام، تو وہ مختلف اسباب سے مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ مثلاً، ایک قسم ان خوابوں کی ہے جن میں ایک گمراہ آدمی یا کمزور عقائد کے آدمی کو شیطان آ کر کسی باطل کے حق ہونے یا کسی حق کے باطل ہونے کا یقین دلاتا ہے، اور اسے کچھ ایسی شکلیں دکھاتا ہے اور ایسی باتیں سناتا ہے جو اس کو گمراہ کرنے کی موجب ہوتی ہیں۔ ایک اور قسم ان خوابوں کی ہوتی ہے جن میں آدمی کے اپنے اوہام، تخیلات، خوف، نفرت، لالچ یا خواہشات وغیرہ اس کے سامنے متمثل ہو جاتی ہیں۔ ایک اور قسم ان خوابوں کی ہوتی ہے جو کسی بیماری کے اثر سے آدمی دیکھتا ہے۔ ان مختلف قسم کے خوابوں کو اگر جمع کیا جائے تو ان سب کی توجیہ فرائڈ کے نظریات کے تحت نہیں کی جا سکتی اور نہ ان سے

نتائج اخذ کرنے، یا ان کے معنی متعین کرنے کے لیے دوسرے ماہرین نفسیات کے طریقے (TECHNIQUES) کافی ہیں۔ ان لوگوں کا عیب یہ ہے کہ پہلے یہ ایک نظریہ قائم کر لیتے ہیں اور پھر اپنے قائم کردہ نظریے کے تحت سارے خوابوں کی ایک خاص لگی بندھی تعبیر کرتے چلے جاتے ہیں۔ حالانکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ بکثرت خوابوں کو جمع کر کے، اور ان کے دیکھنے والوں کی زندگی کا اچھی طرح مطالعہ کر کے یہ رائے قائم کی جائے کہ اضغاث احلام کس کس قسم کے ہوتے ہیں اور مختلف حالات میں مختلف لوگوں کو وہ کن کن اسباب سے نظر آتے ہیں۔

آپ کے اکثر سوالات کا جواب اوپر دے دیا گیا ہے۔ باقی سوالات کا جواب یہ ہے کہ اسلامی نظریۂ خواب تو صرف قرآن اور احادیث صحیحہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ بعد میں مسلم مفکرین نے جو نظریات بیان کیے ہیں ان کو آپ انہی مفکرین کے نظریہ کی حیثیت سے بیان کریں۔

بظاہر یہ سمجھنے کے لیے کوئی معقول وجہ نہیں ہے کہ خواب کی سچائی کا وقت سے کوئی خاص تعلق ہے۔

سچے خواب کو نبوت کے اجزاء میں سے ایک جز قرار دینے کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی کی نوعیت لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اضغاث احلام کی قسم کے نہیں ہوتے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ سچا خواب چونکہ انسانی روح اور ملاء اعلیٰ کے درمیان ایک ایسے رابطہ کا نتیجہ ہوتا ہے جس میں انسانی خواہش، ارادہ یا شعور حائل نہیں ہوتا، اس لیے وہ بہت خفیف سی مماثلت اس رابطہ کے ساتھ رکھتا ہے جو نہایت اعلیٰ اور مکمل صورت میں نبی کے قلب اور ملاء اعلیٰ کے درمیان تشکیل وحی والہام قائم ہوتا ہے۔

(بقیہ اشارات)

اپنے کام کا راستہ نکالنا ہے۔ ایک طرف مغربی تہذیب کی یلغار ہے جس نے مشرق کی پوری اجتماعی زندگی کو مغلوب کر رکھا ہے۔ پھر اس تہذیب کی پُشت پر ترقی یافتہ مغرب کے لاتعداد وسائل ہیں۔ اس تہذیب نے جس نظامِ ریاست کو جنم دیا ہے اُس کا مزاج اوّل سے آخر تک کلیت پسندانہ ہے اور اس کا دائرہ زندگی کے سارے گوشوں پر پوری طرح محیط ہے۔ معیشت و معاشرت تو خیر حیاتِ انسانی کے خارجی شعبے ہیں۔ انسان کی روح بھی آج آزاد نہیں۔ معاشی مسائل نے انسان کو اتنا اُلجھا دیا ہے کہ اسے سوائے کمانے اور کھانے کی فکر کے اور کوئی فکر دامنگیر نہیں ہوتی۔ اُس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوتا کہ وہ خدا، آخرت، روح اور اخلاق کے بارے میں کچھ سوچ سکے۔ معاشی منصوبہ بندیوں نے صرف اس کی معاشی زندگی کو ہی ایک خاص نہج پر مرتب نہیں کیا بلکہ اُس کی معاشرتی اور اخلاقی زندگی کو بھی ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اس سانچے میں مذہب اور اخلاق کی قطعاً کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی گئی۔

آپ ذرا ان حالات کو سامنے رکھ کر ایمانداری سے سوچیں کہ ایک ایسی جماعت جس کا مقصد صرف روحانی تسکین کا سامان فراہم کرنا نہ ہو، بلکہ جو مادی تہذیب کے ہمہ گیر تسلّط کو ختم کرنا اور اُس کی جگہ ایک ایسی تہذیب کو نافذ کرنا چاہتی ہو، جو روح اور اخلاق کی نشو ونما کے لیے سازگار ماحول مہیّا کر سکے، کیا اُس کے لیے اِس کے سوا کوئی چارۂ کار ہے کہ وہ سب سے پہلے ایک ایسا اجتماعی نظام قائم کرنے کی فکر کرے جس میں اُسے کام کرنے کی نسبتاً زیادہ آزادی حاصل ہو۔ اگر بیشمار ہاتھ آپ کے گلے کی طرف بڑھ رہے ہوں اور آپ کو اس امر کا اختیار دے دیا جائے کہ ان میں سے کسی ایک کے ہاتھ میں اپنی گردن دے دو، آپ فطری طور پر اُسی ہاتھ کو قبول کریں گے جس کی انگلیاں نسبتاً نرم اور جس کی گرفت نسبتاً کمزور ہو تاکہ آپ کسی طرح سانس تو لے سکیں۔

جماعت اسلامی جو جمہوریت کی حمایت کر رہی ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اُس نے

حکومتِ الٰہیہ کے نصب العین کو ترک کر کے اب مغربی جمہوریت کو اپنا دین و ایمان بنا لیا ہے۔

جماعت کا مقصد اب بھی اسلامی نظام کا قیام ہے اور مغربی طرز کی جمہوریت کو وہ آج بھی اسی نگاہ سے دیکھتی ہے جس نگاہ سے وہ اسے پہلے دیکھتی تھی۔ لیکن اِس وقت اُس کے سامنے جو مسئلہ درپیش ہے وہ حکومتِ الٰہیہ اور جمہوریت کے درمیان انتخاب کا نہیں بلکہ آمریت اور جمہوریت کے درمیان کسی ایک کو ترجیح دینے کا ہے۔ آمریت جیسے کہ ہم گزشتہ صفحات میں بیان کر چکے ہیں، اُن جکڑبندیوں کو انتہائی شدید بنا دیتی ہے جو زمان و مکان کے سمٹ جانے کی وجہ سے اور منصوبہ بندیوں کی وجہ سے پہلے ہی کافی سخت ہیں۔ اِس بنا پر دینی تحریکات کو ملیامیٹ کرنے کے لیے جہاں کسی دوسرے نظامِ حکومت کو لمبی مدت درکار ہوتی ہے وہاں آمریت کی بے پناہ قوت و طاقت اُسے بڑے قلیل عرصہ میں ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ مغربی تہذیب کے تسلط نے یوں بھی اسلام کے لیے عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے، لیکن اگر اس تہذیب کو آمریت کی پشت پناہی حاصل ہو جائے تو اسلام کا ترقی کرنا تو خیر بڑی بات ہے اس کے لیے جینا بھی ناممکن ہو گا یہی وجہ ہے کہ مغرب کی بیشتر اقوام جو اپنے ہاں جمہوریت اور آزادی کی دلدادہ ہیں اور اس کی حفاظت کے لیے بڑی سے بڑی قربانی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں، وہی مشرق کے متغربین کو آج مسلسل یہ درس دے رہی ہیں کہ اس سرزمین میں مغربی تہذیب کی کامیابی کا انحصار سراسر آمریت پر ہے اور یہ آمریت جتنی سخت، جتنی بے رحم اور یہاں کے عوامی احساسات و جذبات سے جتنی بیگانہ اور عاری ہو گی اتنی ہی مغربی تمدن کے تسلط کے لیے مفید اور کارآمد ہو گی۔

جماعت اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا جو کچھ گناہ ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے معاملے میں بین الاقوامی اور ملکی حالات کی سنگینی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور مغربی تہذیب کے ہمہ گیر تسلط سے بچنے کے لیے آمریت کے مقابلے میں ایک ایسے نظامِ حکومت کو ترجیح دیتے ہیں جو اندھا بہرا نہ ہو بلکہ عوام کے دل کی دھڑکنیں سننے والا اور اُن کی خواہشات کا کسی حد تک احترام کرنے والا ہو، جس میں عوام کی رائے کچھ زیادہ مؤثر ہو سکے، اور جس میں دینی کی طرح دین کے لیے بھی کام کرنے کی سہولتیں ہم پہنچ سکیں۔ اِس نظام میں بھی بلاشبہ اسلامی قوتوں کو اجتماعیت کے اُس دیو استبداد سے، جس کے سر میں مغربی تہذیب کا سودا سمایا ہوا ہے نبرد آزما ہونا پڑیگا۔ اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے لیکن عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اس دیو کو ملک کے سارے

ذرائع وسائل کا اس طرح بلا شرکتِ غیرے مالک بننے دیا جائے کہ وہ اپنے کسی مخالف کو دم مارنے تک کا موقع نہ دے اور جبر کے ساتھ اسلام کے سارے نقوش کو مٹاتا چلا جائے۔

آمریت کے مقابلے میں جمہوریت کے اندر جس چیز کی توقع کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب کا دیو ملک کے سارے وسائل کا تنہا مالک ہوگا۔ اگر بالفرض وہ مالک ہو بھی جائے تو پھر بھی کسی آئین اور قانون کا پابند رہیگا۔ اور اس طرح اندھا دھند بغیر کسی رکاوٹ کے زندگی کے سارے معاملات میں دخل اندازی کرنے پر قادر نہ ہوگا۔ وہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہوگا کہ لوگوں کے چہرے کے اضطرابات پر مسلسل نگاہ رکھے اور انہیں اچھی طرح دیکھ کر کوئی قدم اٹھائے۔ اس حزم و احتیاط کی وجہ سے اور ان دستوری اور آئینی پابندیوں کی بنا پر عوام کو ایک دائرے میں کام کرنے کی آزادی ہوگی اور اسلامی قوتیں اس دائرے میں خواہ وہ کتنا ہی تنگ ہو، جاہلیت کا بے جگری سے مقابلہ کرسکیں گی۔ انہیں رائے عامہ ہموار کرنے کی آزادی ہوگی اور انہیں مغربی تہذیب کی ریشہ دوانیوں کو طشت از بام کرنے کی آزادی ہوگی۔ انہیں اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو سمیٹنے کی آزادی ہوگی۔ انہیں حکومت کے غلط عزائم کو بے نقاب کرنے کی آزادی ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قوم جو فیصلہ کرے گی وہ پوری طرح سوچ سمجھ کر کرے گی اور ہمیں یقین ہے کہ اگر آمریت کا دیو جبر و تشدد کے بل بوتے پر مسلم قوم کو مغربی تہذیب کے جہنم میں نہ جھونک دے اور اسے اس امر کا اختیار دے کہ وہ اپنی منشا و مرضی کے مطابق اپنے مستقبل کا فیصلہ کرے تو وہ اتنی حماقت نہ کرے گی کہ اسلامی تہذیب کی جنت سے منہ موڑ کر مغربی تمدن کی آگ میں کود پڑے

مغربی اقوام، خصوصاً اُن کے دانشور اس صورتِ حال سے پوری طرح باخبر ہیں اور وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اُن کی تہذیب کو کس گوشے سے کس قدر خطرہ لاحق ہے۔ اسی لیے اُن کی سب سے زیادہ نظرِ کرم جماعت اسلامی اور اس کے محترم امیر پر ہی پڑ رہی ہے۔ آپ اگر اُن کی تحریروں کا مطالعہ کریں تو آپ کو اس امر کا احساس ہوگا کہ انہیں اسلام کے روحانی نظام سے کوئی زیادہ شکایت نہیں بلکہ وہ اس بات پر سخت برہم ہیں کہ اسلامی تعلیمات پر کسی حکومت کی

تشکیل کی جاتے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کی کوئی حکومت مغربی تہذیب کی تائید و حمایت سے صرف دستکش ہو جاتے اور وہ عوام کو اس بات کا موقع دے کہ وہ اپنی منشا کے مطابق نظامِ زندگی کا انتخاب کریں تو وہ لازمی طور پر سیناتے کے الفاظ میں "صدیوں کے پرانے، بوسیدہ اور رجعت پسندانہ نظام کو ہی منتخب کریں گے"۔ اس لیے جو لوگ بھی مغربی تہذیب کے مقابلے میں اسلامی نظامِ حیات کے علمبردار ہیں اور اُسے واقعات کی دنیا میں نافذ کرنے کا بھی ارادہ رکھتے ہیں وہی اُن کی نظر میں خار کی طرح کھٹکتے ہیں اور اُن کی تحریروں کے ایک ایک حرف سے اُن کے خلاف غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ ایک طرف تو مسلمان حکمرانوں کو اپنے اپنے ممالک میں آمریت کے جابرانہ نظام قائم کرنے کا مشورہ دیتے ہیں اور دوسری طرف دینی جماعتوں کو بڑے زوردار الفاظ میں یہ تلقین کرتے ہیں کہ وہ ریاست اور حکومت سے تعرض نہ کریں اور خاموشی کے ساتھ صرف تبلیغ کرنے میں منہمک رہیں تاکہ آمریت کا جابرانہ نظام اُن کے اپنے قومی وسائل کو ہی بڑی آزادی کے ساتھ انہیں ختم کرنے میں صرف کر سکے اور انہیں اتنی تیزی سے مٹا دیا جائے کہ کوئی لفظ احتجاج یا حسرت کے طور پر بھی ان کی زبان سے نکلنا ممکن نہ ہو۔

اب یہ ایک عجیب المیہ ہے کہ ایک طرف کفران پر سامنے سے حملہ آور ہے، اور دوسری طرف "دین" کا خنجر پیچھے سے ان کی پیٹھ میں بھونکا جا رہا ہے۔

ضروری اعلان

دفتر ترجمان القرآن اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اور جماعت اسلامی پاکستان کو خط و کتابت کرنے والے حضرات پتہ لکھتے وقت اچھرہ لاہور زون نمبر 12 ضرور تحریر فرما دیں

(ادارہ)

رجسٹرڈ ایل. نمبر [illegible]۷۰

اسلام کے نظامِ سیاسی پر معرکہ آرا تصانیف

اسلامی ریاست

— از: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلام کے نظریۂ سیاسی کی مستند تشریح
- اسلام کے نظامِ ریاست کی مکمل تصویر۔
- علماء، طلباء، قانون وسیاست کے لیے ایک خزینۂ علم

قیمت قسم اعلیٰ بارہ روپے سستا ایڈیشن آٹھ روپے

سُنّت کی آئینی حیثیت

— از: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی —

- سُنّت کیا ہے؟
- سُنّتِ نبوی کا دین میں صحیح مقام کیا ہے؟
- سنّتِ نبوی کی صحت وحفاظت کا ثبوت
- منکرینِ حدیث وسُنّت کا مسکت ومدلّل جواب

آفسٹ کی حسین کتابت وطباعت قیمت ۸/۵۰ روپے

تحریکِ آزادیٔ ہند اور مسلمان

— از: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی —

- قبل تقسیم مسلمانوں کی سیاسی، اخلاقی اور تمدنی حالت کا نقشہ۔
- مسلمانانِ ہند کیلیے صحیح نصب العین اور طریقۂ کار کی نشاندہی۔
- برصغیر ہند وپاک کی پچاس سالہ ہنگامہ خیز سیاست پر بے لاگ تبصرہ

حسین کتابت وطباعت۔ رنگین ڈسٹ کور، قیمت صرف -/۱۰ روپے

الجہاد فی الاسلام

— از: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلام کے نظریۂ جہاد پر ایک مدلّل ومستند کتاب
- اسلامی قوانینِ جنگ کا بین الاقوامی اور غیر مسلم اقوام کے قوانینِ جنگ سے موازنہ
- اردو میں جہادِ اسلامی پر پہلی محققانہ اور بے مثال کتاب

قیمت قسم اعلیٰ ۱۱ روپے سستا ایڈیشن ۷/۵۰ روپے

نظامِ اسلامی — مشاہیرِ اسلام کی نظر میں

— مرتبہ: مولانا خلیل حامدی صاحب —

- مراکش سے انڈونیشیا تک عالمِ اسلام کے ممتاز رہنماؤں کی نگارشات کا مجموعہ۔
- ملّتِ اسلامیہ کے جسدِ خوابیدہ کو دعوتِ انقلاب وعمل
- معاندینِ اسلام کا بھرپور اور مدلّل جواب۔

۵۰۰ صفحات سے زائد۔ قیمت صرف ۶/۵۰ روپے

اسلامی تہذیب اور اس کے اصول ومبادی

— از مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی —

- اسلامی تہذیب کی بنیادیں کیا ہیں؟
- اسلامی تہذیب اور غیر اسلامی تہذیب کا فرق اور موازنہ
- اسلامی تہذیب کی برتری پر مدلّل تفصیلی بحث

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۴/۲۵ روپے

" سستا " ۳/۰۰ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ، شاہ عالم مارکیٹ لاہور